بوری والا

جیشری کلاِتھل

آرٹ

راکھی پیشوانی

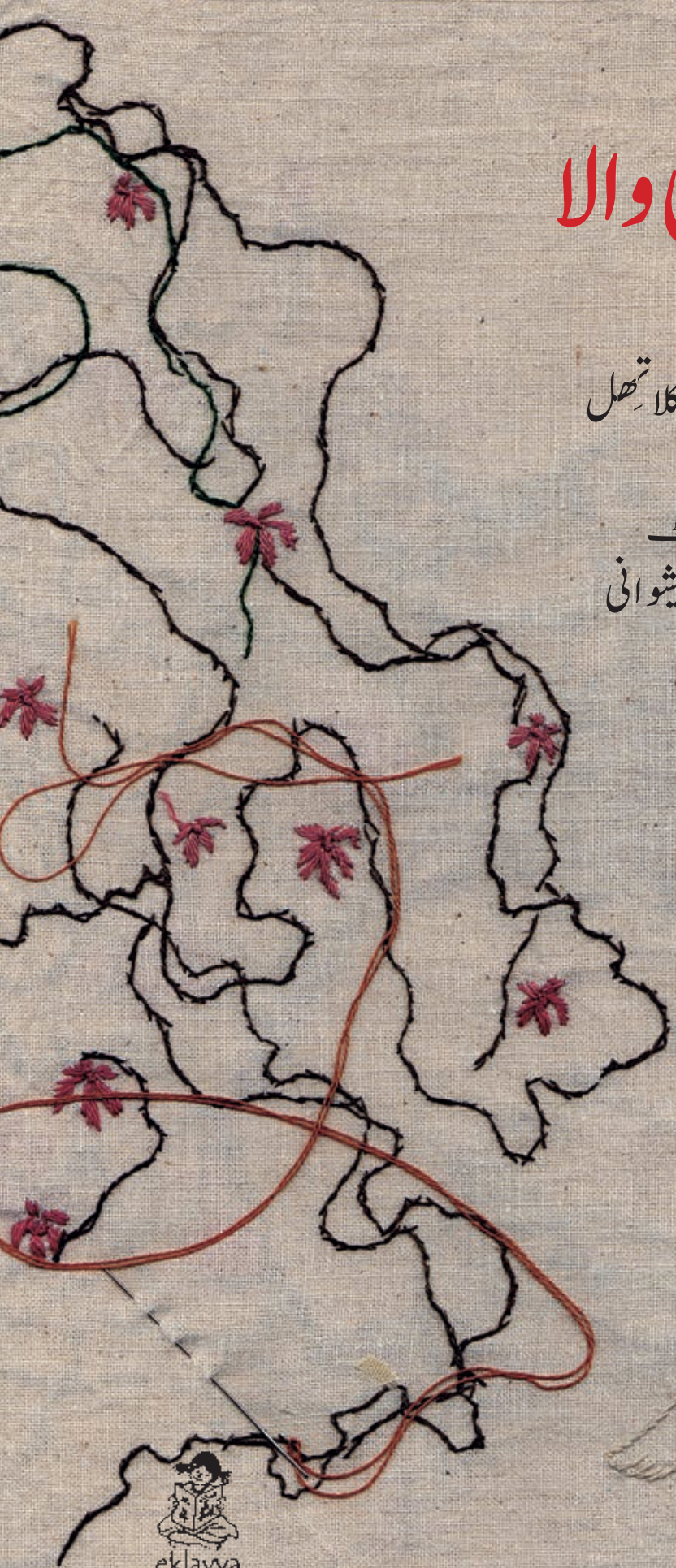

eklavya
Anveshi

بوری والا

جیشری کلا تھل

آرٹ

راکھی پیشوانی

ترجمہ

ایم. اے. معید

محمد مجیب الدین

سیریز ایڈیٹر

دیپتا آچار

اُردو ایڈیٹرز

اسماء رشید اور ایم. اے. معید

eklavya

Anveshi

فاطمہ ٹیچر کی کرسی کے پیچھے دیوار پر لگی بڑی گھڑی میں چار بجنے میں ابھی تین منٹ باقی تھے۔ آیا اماں گھنٹی بجانے کے لیے اسکول کے آنگن کی جانب جارہی تھی۔ یہ اِس سال کی آخری گھنٹی تھی کیوں کہ کل سے گرما کے چُھٹیاں شروع ہونے والی تھیں۔

پر مجھے چُھٹیوں کا انتظار نہیں تھا۔ اتنی تسلّی تھی کہ فاطمہ ٹیچر سے کچھ دِنوں کے لیے پیچھا چھوٹ جائے گا جو ہمیشہ میری خراب لکھائی کے پیچھے پڑی رہتی ہیں۔ آئندہ سال کچھ ایسا ہو جائے کہ مجھے اُس سونے کی بالیوں اور گلابی ربّنوں والی مالتی کے بازو میں نہ بیٹھنا پڑے۔ اچّھا ہی ہوا کہ اسکول بند ہو گیا۔یہ پہلی چُھٹیاں ہوں گی جب میری بڑی بہن سجی چیچی میرے ساتھ نہیں ہوں گی۔پورے دومہینے کیسے گزریں گے؟کیاکروں گی میں!

گھنٹی بج گئی۔فاطمہ ٹیچر کو اپنی جانب آتے دیکھ کر میں تیزی سے کتابیں بستے میں رکھنے لگی۔

''تو چھٹیوں کا انتظار تھا تمہیں،اَنّو؟'' ٹیچر نے پوچھا۔

''ہاں!'' انھیں اپنے دل کی بات بتانے کا فائدہ بھی کیا تھا۔

''کوئی پلان ولان ہے؟''

''ابھی تو نہیں'' میں نے کہا۔
''مجھے ہے۔اماں انتظار کر رہی ہوں گی۔''

میں جلد ہی باہر نکل گئی۔ وہ بھی کلاس سے نکلیں اور آیا اماں سے باتیں کرنے لگیں۔میں جانتی تھی وہ کیا باتیں کر رہی ہوں گی۔''کتنی اکیلی ہو گئی نہ...بہن مر گئی...ماں کی حالت ایسی ہو گئی... اور نکمّا باپ...''

مجھے ان سب باتوں سے نفرت ہے۔ ہر دن لوگ میرے چاروں طرف اِسی طرح کی کُھس پُھس کرتے رہتے تھے۔ سجی چیچی کو ان سرگوشیوں کا خا تمہ کرنا خوب آتا تھا۔ پریشان کرنے والوں کو کس طرح خاموش کرنا ہے وہ اچھی طرح جانتی تھی۔مگر ابھی تو وہ خود ہی ان کا نشانہ بنی ہوئی تھی۔ چار مہینے تیئیس دن پہلے سجی چیچی کا انتقال ہو گیاتھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ کیسے ہلکا سا بُخار اتنا بڑھ جائے گا کہ ان کی جان ہی چلی جائے گی۔ ڈاکٹر پربھاکرن نے انھیں میڈیکل کالج سے جُڑے اسپتال کو بھی بھیجا تھا پر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

میں اب اُس سب کے بارے میں بالکل سوچنا نہیں چاہتی ۔سوچتی تو رو دیتی اور روتی ہی رہتی۔مجھے اُن کی بہت یاد آتی تھی،ہمیشہ آتی تھی۔ میں ان کے بغیر کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ کاش، وہ واپس آجاتی اور مجھ پر حکم چلاتی...مجھے بتاتی کہ میں کیاترکیب اختیار کروں کہ اماں بسترسے اُٹھ جائیں اورکچھ کھاپی لیں۔کیوں کہ اُن دنوں اماں دن بھر صرف بستر پرہی لیٹی رہتی تھیں۔

میں چاہتی تھی کہ وہ واپس آجائے اور بتائے کہ میں کیا کروں کہ اَچّن کام کے بعد گھر آجائیں۔درمیان میں واقع رادھاکرشن کے شراب خانے پر رک نہ جائیں۔

اس کے علاوہ سجی چیچی کئی چھوٹی چھوٹی چیزیں مجھے سکھاتی تھی جیسے صفائی سے پیر کے ناخن پر نیل پالیش لگانا، جیسے پانی میں سانس کچھ اِس طرح روکناکہ ہلکی چیز کے مانند اوپر اُچھل کر نہ آجاؤں۔ اب بھی میں صرف سولہ کی گنتی تک پانی کے نیچے رہ سکتی ہوں۔ پھر میرے پھیپھڑے ہوا کے لیے بے چین ہوجاتے ہیں۔ اب میں اس سے زیادہ کبھی نہ سیکھ پاؤں گی۔

آہ!وہ مجھے کتنا یاد آتی ہے!

اسکول کے کچھ بچّوں کا گروپ 'نیاڈیپّرا' جارہا تھا۔ اُن میں میری جماعت کے بھی کچھ دوست تھے۔ اُنھیں آج گھر جانے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ ان کو نظر انداز کرتے ہوئے میں دوڑ پڑی۔ میرا گھر دھوپ میں خاموشی سے تپ رہا تھا۔ گڈھیل کے پھول پیاسے لگ رہے تھے ،شام کو اُنھیں پانی دینا ہی پڑے گا۔

باورچی خانے میں اندھیرا تھا،شاید امّاں نے آج کچھ نہیں پکایا۔ میں اندر گئی، وہاں رکھے کیلوں میں سے دو کیلے کھائے اور اوپر چلی گئی۔ امّاں بستر پر لیٹی ہوئی تھیں، وہ تھکی ہوئی اور اُداس لگ رہی تھیں۔ اَب ایسا روز ہوتا تھا۔میں ان کے بستر پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔ اُنھوں نے دیکھا اور مجھے گلے لگا لیا۔

''کیسا تھا اسکول؟'' انھوں نے پوچھا۔

''ٹھیک تھا۔کل سےاسکول نہیں جانا ہے۔''

''کیوں؟''

''امّاں، گرما کی چُھٹیاں ہیں۔ امتحان ختم ہوگئے ہیں، اب جون تک اسکول نہیں جانا پڑے گا۔''

امّاں کو جیسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہاتھا۔ ''گرمیوں کی چُھٹیاں شروع ہو گئی کیا؟ تو تم سارا دن اب گھر میں ہی رہو گی؟'' انھوں نے اپنی آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔''اب میں تمہارا کیا کروں گی؟''

وہ پریشان لگ رہی تھیں۔میں ان کے چہرے کی مایوسی دیکھ کر بول اُٹھی۔''تم زیادہ فکرمت کروامّاں۔'' میں ان سے چپک کر بیٹھ گئی۔ ''میں نے رشیدہ کے ساتھ کئی پلان بنا لیے ہیں۔ میری فکر مت کرو۔'' سجی چیچی کے بعد میری سب سے اچھی دوست رشیدہ ہی تھی۔

امّاں میری بات سُن رہی تھیں اس لیے میں نے اپنی بات کہنے کا موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا۔''امّاں، تم اٹھ کر نہا کیوں نہیں لیتی؟میں تمہارے لیے پانی گرم کر دیتی ہوں۔پھر دونوں مل کر گڈھیل کے پودوں کو پانی دیں گے۔''

''اٹھتی ہوں...بس ایک منٹ میں،''وہ بولیں۔''بس تھوڑی دیر آرام کرلوں۔ تب تک تم پودوں کو پانی کیوں نہیں دے آتی؟ پھر میں اٹھ جاؤں گی۔'' وہ پھر سے اپنے خیالوں میں گُم ہوگئی تھیں۔

مجھے احساس ہو گیا تھا کہ آج وہ نہیں اُٹھیں گی۔اُن کے کچھ دن اچّھے ہوتے تھے کچھ خراب۔ آج خراب دن کی باری تھی۔ ڈاکٹر پربھاکرن اسے ڈپریشن کہتے تھے۔ میں اُن کے بغل میں لیٹ گئی۔ اُن کے جسم سے غنودگی ٹپک رہی تھی۔پہلے جب وہ کام کے بعد واپس آتیں تھیں تو سب کچھ بہت الگ ہوتا تھا۔کبھی کبھی اچّن بھی ساتھ ہوتے اور گُڑھیل کے پھول اپنے کان میں لگا کر مٹکتے ہوئے 'ہواہوائی' پر ناچنے لگتے تھے۔سجی چیچی اورمیں ان کے آس پاس اُچھلتے رہتے۔ امّاں زور زور سے ہنستی تھیں۔پھر جھوٹ موٹ کا غُصّہ دِکھاتیں۔ وہ ہم دونوں کو کنگھی کرتیں اور چوٹیاں باندھ دیتیں۔ ہم دونوں اپنا اسکول کا کام کرتے اور اُس کے بعد رات کا کھانا کھاتے۔کھانے کے بعد مل کر ساتھ 'ایشیا نیٹ' ٹی وی چینل پر 'اِستری' سیریئل دیکھتے۔

آج کل اَچّن گھر پر کم ہی رہتے ہیں اور رات کو دیر سے گھر آتے ہیں۔ کبھی کبھی جب وہ مجھے دیکھنے میرے پاس آتے تو میں جاگ جاتی۔ آج میں نے سوچ لیا کہ اُن کے آنے تک جاگتی رہوں گی۔ میں اُٹھی اور پودوں کو پانی ڈالنے باہر گئی۔

میں نے 'اِستری' سیریل نہیں دیکھا۔ اکیلے ٹی وی دیکھنا کتنا بدمزہ لگتا ہے۔ اِس سیریل میں ہوتا بھی کیا تھا۔ بس رونا، رونا اور رونا۔ اس کے بجائے میں نے سوچا کہ کچھ لکھ لیتی ہوں۔ میں بڑی ہوکر قلم کار بننا چاہتی تھی۔ اَچّن کہتے تھے کہ قلم کار بننے کے لیے ہمیشہ لکھتے رہنا ضروری ہے۔ اب تک میں نے دو کہانیاں لکھی تھیں۔ ایک تھی 'میرا گاؤں میلے کرا' اور دوسری ' فاختہ اور بندر'۔ یہ کہانی ایک کبوتر، ایک سپاہی اور ایک بندر کی تھی جو پوری دنیا ایک ساتھ گھومنے جاتے ہیں۔ اَچّن اُسے 'سفرنامہ' کہتے تھے اوریہ بھی کہتے تھے کہ ایک دس سال کی بچّی کے لیے ایسا لکھنا تو 'ایک بڑا کارنامہ' ہے۔

میں فرش پر لیٹی سوچنے لگی کہ اَب کیا 'کارنامہ' جیسی چیز لکھی جائے۔ تبھی پیچھے والے دروازے سے کوئی آواز آئی۔ میں سمجھ گئی کہ وہاں کون ہوسکتا ہے۔ میں آہستہ سے باورچی خانے میں پہنچی اور کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ وہاں چھوٹے سے بلب کی مدّھم روشنی میں بوری والا کھڑا ہوا نظر آیا۔ میں جانتی تھی کہ وہ بھوکا ہوگا اور کچھ کھانے کی تلاش میں آیا ہوگا۔ امّاں ہمیشہ اُسے تھوڑی چاول کی گنجی دے دیتی تھیں۔ مجھے اس سے تھوڑا ڈر لگتا تھااور آج گنجی بھی نہیں تھی۔ اگرمیں خاموش رہوں توکیا معلوم وہ چلا ہی جائے۔

بوری والا کچھ عجیب سا تھا۔ وہ پھٹے پرانے ٹاٹ کے ٹکڑوں کو سی کر پہنتا تھا۔ اِس لیے لوگ اسے ''بوری والا'' پکارتے تھے۔ ایک دن رشیدہ کی دادی خدیجہ امّاں نے بتایا کہ جب وہ 'میلےکرا' میں پہلی بارنظر آیا تھا تب وہ بہت عمدہ کپڑے پہنے ہوئے تھا اور بہت اچھا لگتا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھاکہ وہ کہاں سے آیا۔ ایک دن وہ آیا اور پھرکبھی واپس نہیں گیا۔

بوری والا ہمارے گھر کے سامنے والی گلی میں، پوسٹ آفس کے قریب والی دوکان کے برآمدے میں سوتا تھا۔مجھے اسے دیکھتے رہنا اچّھا لگتا تھا۔ سجی چیچی کہتی تھی کہ لوگوں کو اس طرح گھورتے رہنا اچھی بات نہیں ہے۔ پوسٹ ماسٹرنی امّنی امّاں ہمیشہ اُس پر غُصّہ میں رہتی کیوں کہ وہ برآمدے میں پیشاب کرتا تھا۔ پر اُنھوں نے اسے وہاں سے بھگانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ جب صبح وہ پوسٹ آفس کھولتیں تو بوری والا خاموشی سے اُٹھ کر چلا جاتا۔ مجھے وہ کبھی برگد کے پیڑ کے نیچے بیٹھا اور کبھی اِنگلش اسکول کے باہر ہم بچّوں کو کھیلتے دیکھتاہوا نظر آتا۔کچھ بچّے کبھی کبھی اس کا مذاق اڑاتے پر زیادہ تر لوگ اُسے اُس کےحال پر چھوڑ دیتے تھے۔

صرف ایک وقت سجی چیچی اور میں نے اسے مُرلی مینن سے مارکھاتے دیکھا تھا۔ مُرلی مینن کی سبزی کی دکان تھی۔ ہفتے کے دن ہم اَچّن کے ساتھ بازار گئے تھے۔ بوری والا بازار میں اِدھر، اُدھر گھوم رہا تھا۔وہ بہت جوش میں لگ رہاتھا کیوں کہ وہاں ہر طرف تھیلے پڑے تھے۔ چلتے ہوئے اُس نے مُرلی مینن کی دوکان کے سامنے پڑے ایک خالی تھیلے کو اُٹھا لیا۔ مینن اپنی دوکان میں سے بھاگتا ہوا با ہر آیا اور اسے گالیاں دینے لگا۔ اُس نے اُس کے ہاتھ سے تھیلاچھیننے کی کوشش کی پر بوری والے کا تھیلا واپس دینے کا کوئی اِرادہ نہیں تھا۔ پھر کیا ہو نا تھا؟ مینن اسے مارنے پیٹنے لگا۔ سارے لوگوں نے اُسے بچانے کی کوشش کی اور مینن کو ڈانٹنے لگے۔

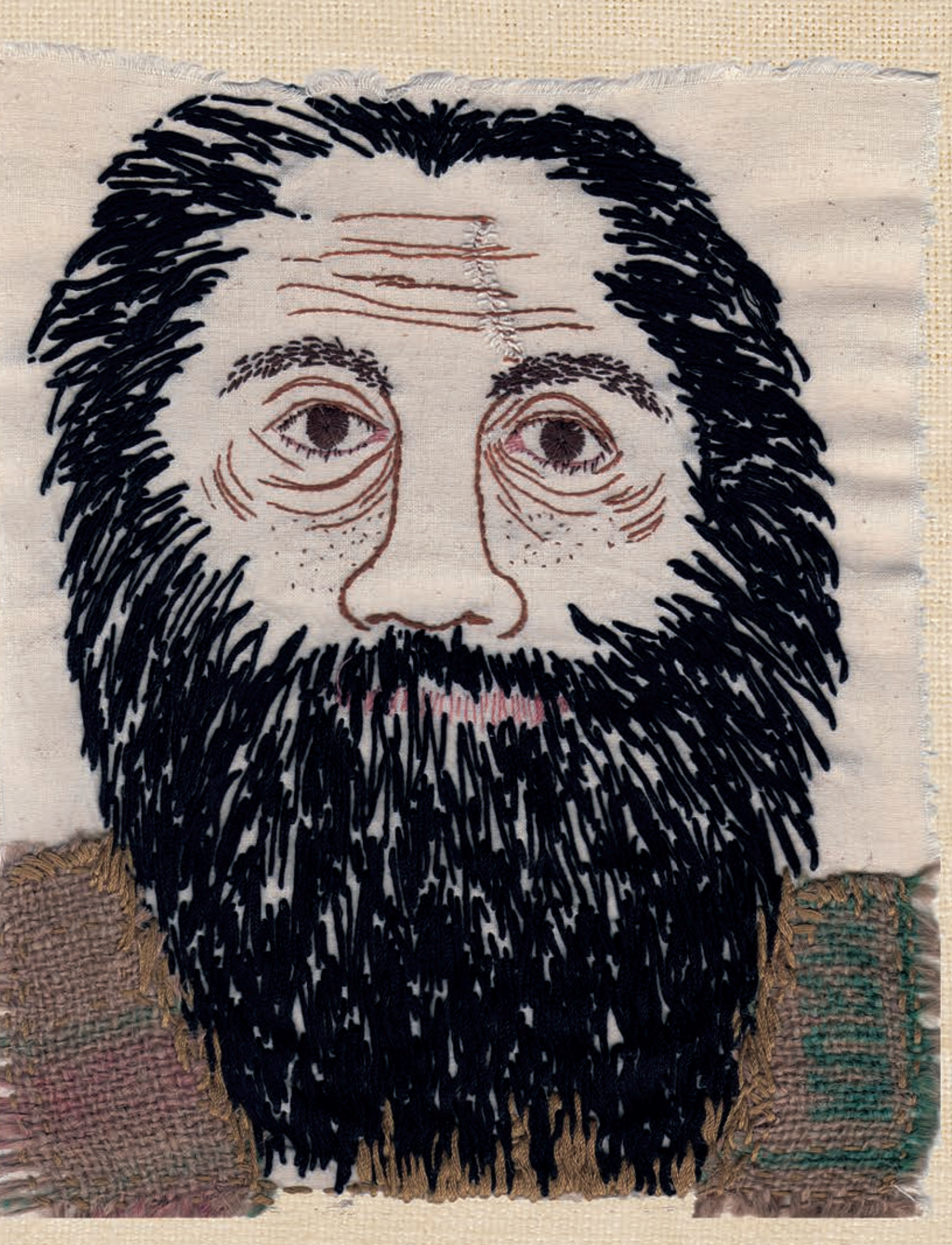

سجی چیچی نے کہا ”آئندہ جب بھی مینن ہمارے گالوں پر چٹکی بھرتے ہوئے ہمیں میٹھائی دے گا، ہم اُسے چِڑاکر بھاگ جائیں گے۔“

مجھے اکثر اُس کے بارے میں الگ الگ خیال آتے تھے جیسے کہ وہ ’میلے کرا‘ میں آیا ہی کیوں تھا؟ اس کا خاندان کہاں تھا؟ اور کیا کوئی اس کا انتظار کر رہا تھا؟ کئی ایسے دن بھی گزرتے کہ اَچّن دس بجے تک بھی گھر نہیں آتے تھے۔ میں پریشان ہوجاتی اور سوچنے لگتی کہ اگر وہ کبھی گھر واپس ہی نہیں آئے تو کیا ہوگا۔ شاید مجھے بوری والے کے خاندان پر ایک کہانی لکھنی چاہیئے۔ جب سوچنے بیٹھتی تو مجھے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

میں نے باورچی خانے کی کھڑکی سے پھر جھانکا۔ وہ چلا گیا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ ہماری پڑوسی مادھوی امّاں کے گھر گیا ہو۔ میں نے سوچ لیا کہ اگر وہ کل پھر آتا ہے تو ہمّت کرکے اُسے کھانا دوں گی۔

اُس رات میں سو نہیں پائی۔ ایک مچھّر لگا تار میرے کانوں میں بھنبھناتا رہا۔ بیچ میں جب جھپکی لگتی تو ایک ہی خواب آنکھوں میں چلتا رہتا۔ وہ یہ کہ فاطمہ ٹیچر نے صرف مجھے کلاس میں روک لیا ہے اور کہہ رہی ہیں کہ جب تک میرا خط نہیں سدھرتا وہ مجھے جانے نہیں دیں گی۔ پر جب میں ایک سیدھی لکیر میں لکھنے کی کوشش کرتی تو میری لکھائی ’ترشور سے ٹمبکٹو‘ کی طرف چل دیتی۔ سجی چیچی ایسا ہی کہتی تھی۔

نیچے سے آوازیں آرہی تھیں۔ میں نیچے گئی تو دیکھا کہ بڑی امّاں باورچی خانے میں تھیں۔ بڑی امّاں میری بڑی خالہ ہیں۔ مجھے وہ سب سے زیادہ پسند ہیں۔ وہ کہتی تھیں کہ سجی چیچی اور میں بڑے ہوکر بڑی امّاں اور امّاں جیسی نظر آئیں گی۔ پر اَب سجی چیچی کے گذرنے کے بعد معلوم نہیں میں کیسے بڑی ہوں گی۔

امّاں اسٹول پر بیٹھی تھیں۔بڑی امّاں تولیہ سے ان کے بال پونچھ رہی تھیں اور ان کو دھیرے دھیرے ڈانٹ بھی رہی تھیں۔

”تھوڑی کوشش تو کرنی ہی پڑے گی نا شاردا“ بڑی امّاں بول رہی تھیں۔”میں اتنی تیز دھوپ میں کھیتوں کو پار کر کے روز تمہارے پاس کب تک آؤں گی؟ یہاں آنے کے لیے رکشا بھی نہیں ملتا۔“

امّاں نے کچھ نہیں کہا، بس سر جھکا کر بیٹھی رہیں۔

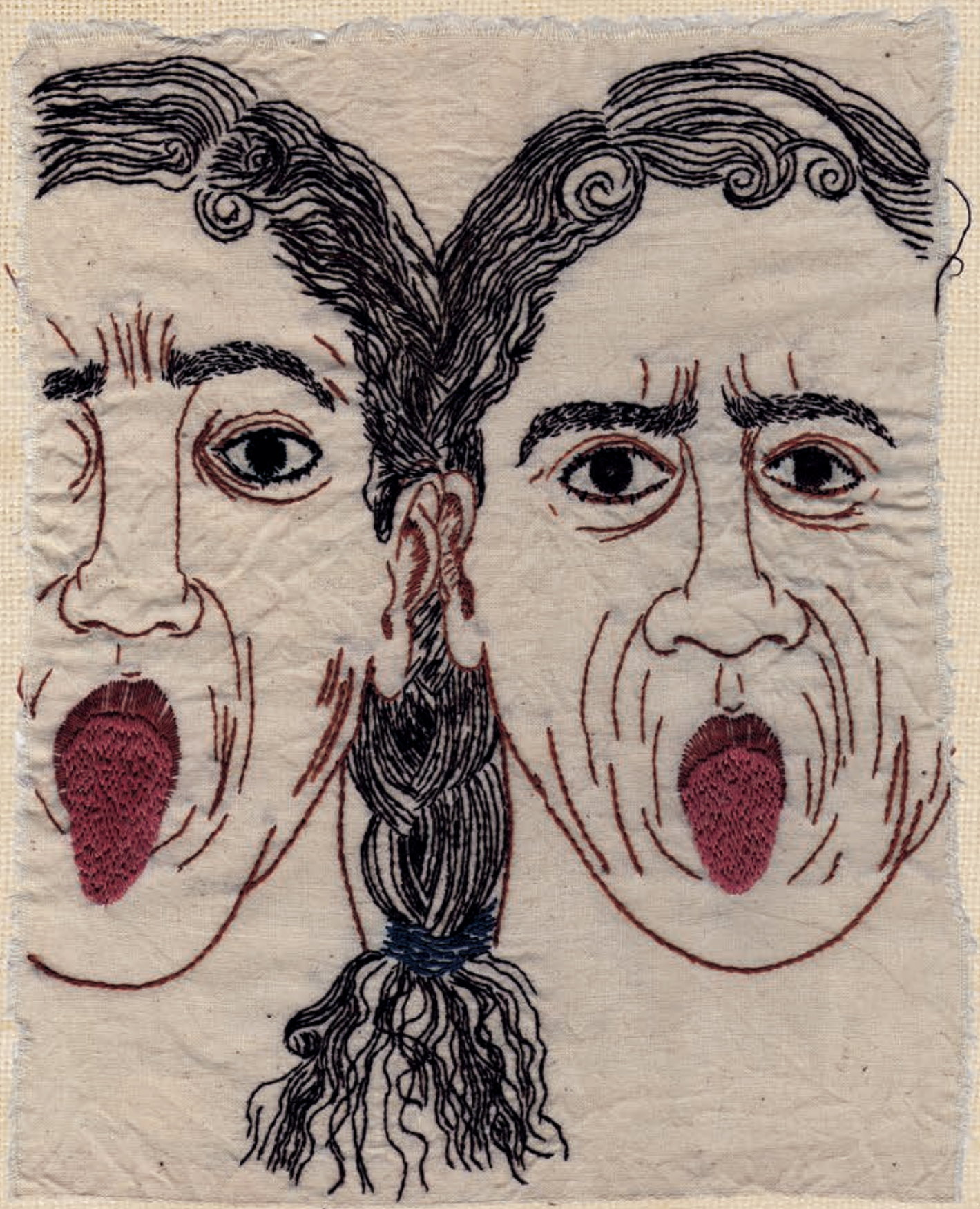

''کل تم نے اپنی دوائی لی؟'' بڑی امّاں نے پوچھا۔ ''شراب خانے پر راتیں گزارنے کے بجائے کاش رامو اپنی کچھ ذمہ داری سمجھتا۔ تم دونوں شاید یہ بھول گئے ہو کہ تمہاری ایک بچّی بھی ہے جو ابھی زندہ ہے۔ وہ آوارہ بلیوں کی طرح سارا دن یہاں وہاں بھٹکتی رہتی ہے۔ تم دونوں نے کبھی اُس کی فکر کی کہ اس نے کھایا پیا ہے کہ نہیں؟ اسکول وقت پر جا رہی ہے کہ نہیں؟''

بڑی امّاں کا اِس طرح بولتے جانا مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا تھا۔میں جانتی تھی کہ وہ ہمارے لیے پریشان تھیں۔ پر اُس سے امّاں اور بھی اُداس ہو جاتی تھی۔ میں جب اندر پہنچی تو مجھے دیکھ کر وہ چپ ہو گئی۔

''انّو،نیند اچھی آئی؟ کافی پیو گی؟''

میں نے کافی لی اور امّاں کے بغل میں بیٹھ گئی۔ انھوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا، ''آج تو اسکول نہیں ہے۔ کیا سوچا ہے...سارا دن کیا کرو گی؟''

''میں رشیدہ سے ملنے جاؤں گی۔ پھر ہم انگلش اسکول کے میدان میں کھیلیں گے۔''

''باہر مت کھیلنا۔دھوپ لگ جائے گی۔'' امّاں اسٹول سے اُٹھتے ہوئے بولیں۔

''ناشتہ نہیں کرو گی؟'' بڑی امّاں نے امّاں سے پوچھا۔

''کروں گی۔پر تھوڑا لیٹنے کے بعد،'' کہتی ہوئی امّاں سیڑھیاں چڑھنے لگیں۔

بڑی امّاں کچھ کہنا چاہتی تھی پر رُک گئی، پھر میری طرف دیکھتی ہوئے بولیں''منجن کرلو۔ پھر ناشتہ کر لینا۔ میں نے اُپما بنایا ہے۔''

اَچّن کام پر جا چُکے تھے۔ ناشتے کے بعد بڑی امّاں نے امّاں کو زبردستی دودھ کے ساتھ دوائیاں دیں۔ امّاں کو دوا پسند نہیں تھی۔ وہ کہتی تھیں کہ دواؤں سے انھیں نیند آتی ہے۔کبھی کبھی مجھے ایسا محسوس ہو تا تھا کہ یہ صحیح بھی ہے۔ بڑی امّاں جب نہیں ہوتیں تب دوا لینے کے لیے مجھے شاید امّاں کے پیچھے نہیں پڑنا چاہیے۔

بڑی امّاں کے جانے کے بعد میں نے فریج کھول کر دیکھا۔ انھوں نے بہت سا کھانا پکاکررکھا تھا۔ چلو، امّاں کو اِس بارے میں تونہیں سوچنا پڑے گا۔ تو اب کیا کیا جائے؟ کچھ سمجھ میں نہیں آیا توسوچا چلو کچھ لکھتی ہوں۔ ہو سکتا ہے کہانی لکھ لوں تو اَچّن اُسے پڑھنے اور اصلاح کرنے کے بہانے ایک شام میرے ساتھ گزار لیں گے۔

میں نے ایک چھوٹی لڑکی ڈیزی کے بارے میں لکھا تھا جس کے پاس جادوئی طاقتیں تھیں۔ وہ پیڑوں،جانوروں اورپرندوں سے باتیں کرسکتی اوراُن کی باتیں سن سکتی تھی۔ اِس لیے اُسے کبھی اکیلاپن محسوس نہیں ہوتا تھا۔ پر اَب اُس کے بعدکیا لکھوں... کچھ سمجھ میں نہیں آرہاتھا۔ اس سے کیا کارنامے کرواؤں کچھ سوچ نہیں سکی۔

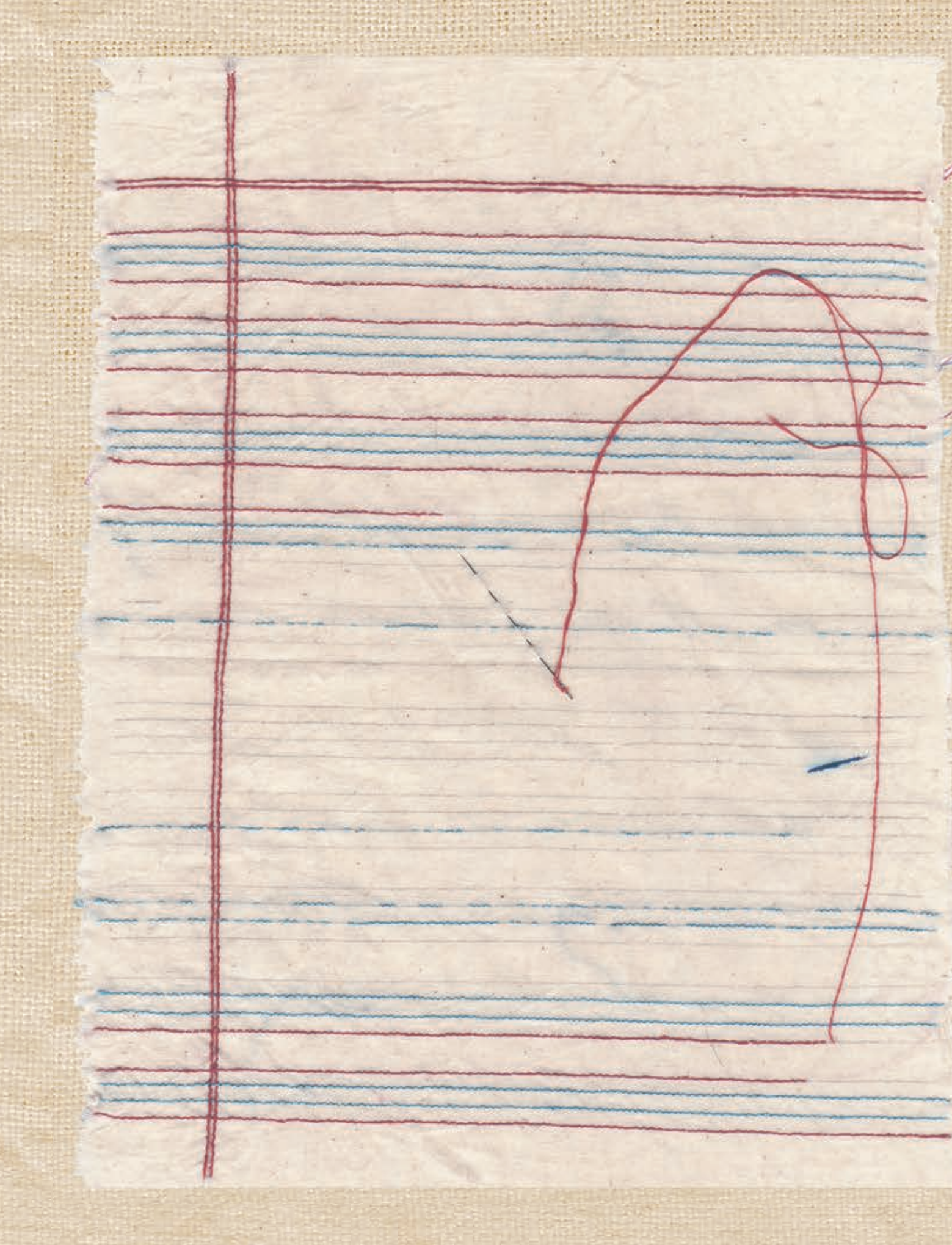

میں نے سوچا کہ چلو رشیدہ کے گھر چلتی ہوں۔ امّاں کو اطلاع دینے گئی تو دیکھا وہ دیوار کی طرف منھ کر کے سو رہی ہیں۔ میں نے آہستہسے کہا 'جا رہی ہوں، کوئی جواب نہیں ملا اور میں چلی گئی۔

رشیدہ میرے گھر سے گیارہ گھر دورانگلش اسکول کے پاس رہتی تھی۔ وہ بھی بور ہو رہی تھی اور اُسے بھی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ہم نے باہر تھوڑی دیر کِرکٹ کھیلا۔ جب دھوپ تیز ہو گئی تو ہم گھر آگئے اور سانپ سیڑھی کھیلنے لگے۔ رشیدہ نے بتایا کہ وہ دو ہفتوں کے لیے اپنے کزن کے گھر 'ارناکولم' جا رہی ہے۔

''ہم وہاں واٹر ورلڈ جائیں گے،کشتی میں بیٹھیں گے اور پھر اس کے بعدبہت سی فلمیں دیکھیں گے،''اس نے بتایا۔''تم بھی کہیں جا رہی ہوکیا؟''

میں نے کہا ''نہیں،میں بس ٹی وی پر فلمیں دیکھوں گی اور ویڈیو دیکھوں گی۔'' رشیدہ نے کہا کہ اس کے پاس 'بلرام' کی نئی سریز ہے۔ وہ مجھے پڑھنے کے لیے دے گی۔واپسی میں، میں نےسوچا کیوں نہ ڈیزی کو واٹر ورلڈ میں کسی مہم پر بھیجا جائے؟

امّاں ابھی بھی بستر پر بِنا سوئے لیٹی ہوئی تھیں۔ ''رشیدہ کے گھر پر مزہ آیا؟'' انھوں نے پوچھا۔ میں نے بتایا کہ رشیدہ اپنے کزن کے گھر 'ارناکولم' جا رہی ہے۔ امّاں نے کہا میں چاہوں تو میں بھی اپنے کزن کے گھر 'کالی کٹ' جا سکتی ہوں۔ میں نے اِنکارکر دیا۔ امّاں اور اچّن کو اس طرح اکیلے چھوڑ کر جانا کوئی اچّھا خیال نہیں تھا۔ اور

پھر 'کالی کٹ' میں میرے ساتھ کھیلنے والا کون ہے! وہاں میرے سارے کزن تو کالج میں پڑھتے ہیں۔

میں 'بلرام' پڑھنے لگی۔ کھیلنے اور دیر تک دھوپ میں رہنے سے مجھے نیند لگ گئی۔ جب میں اُٹھی تب تک اندھیرا ہوگیا تھا۔ میں روشنی کیے بغیرہی لیٹی رہی۔تبھی پیچھے کے دروازے پر ایک زور کی آواز آئی۔ میں نے باورچی خانے کی کھڑکی سے دیکھا۔ بوری والا کھڑا تھا۔

میں نے طے کر لیا تھا کہ آج وہ آئے تو اُسے کھانا دوں گی لیکن مجھے ابھی بھی ڈر لگ رہاتھا۔ میں اوپر گئی،سوچا امّاں کو بلا لاؤں پر کوئی جواب نہیں ملا۔

میں پھر سے باورچی خانے میں آگئی اور تھوڑا سا دروازہ کھول دیا۔بوری والے نے مجھے دیکھا اور اپنی پلیٹ میری طرف بڑھا دی۔ وہ ہر جگہ سے ٹیڑھی میڑھی اور پچکی ہوئی تھی۔ میں نے اس سے انتظار کرنے کو کہا اور باورچی خانے میں آکر ایک پلیٹ میں چاول اور سامبرڈالا۔ ایک پاپڑ بھی رکھ دیا۔ پھر وہ پلیٹ باورچی خانے کے دروازے کے باہر رکھ کر جلدی سے پیچھے ہٹ گئی۔ بوری والے نے پلیٹ اُٹھا کراُسے اپنی پلیٹ میں پلٹ دیا اور وہیں بیٹھ کرکھانے لگا۔

میں اُس کو کھاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اُس کے بال گندے اور الجھے ہوئے تھے۔داڑھی بہت گھنی تھی۔ پیشانی پر زخم کا ایک چھوٹا سا نشان تھا۔ دونوں ہاتھوں پر مچّھروں کے کاٹنے کے نشان تھے۔ اس نے اپنے تھیلے میں منھ ڈالے کچھ ڈھونڈااور ٹین کا ایک مگ نکالا۔ یہ اس کی پلیٹ جیسا ہی پچکا ہواتھا۔ میں واپس گئی اور جگ میں پانی لے آئی۔

میں وہیں بیٹھ کرخاموشی سے اُسے دیکھنے لگی۔ کوشش کر رہی تھی کہ اسے گھورتی نہ رہوں۔ وہ ٹھیک سے چبائے بغیرجلدی جلدی کھا رہا تھا۔ کھانے کے بعد اس نے 'کل' جیسا کچھ کہا اور چلا گیا۔

بوری والے کے جانے کے بعد میں ٹی.وی. دیکھنے لگی۔سوچا تھا جب تک اچّن نہیں آتے ٹی.وی. دیکھتی رہوں گی۔ وہ نو بجے آئے، اُن کے پاس سے سگریٹ اور شراب کی بو آرہی تھی۔ سجی چیچی کے اِنتقال سے پہلے وہ بہت کم پیتے تھے۔صرف آرمی والے کرونن ماموں جب کبھی اُن کے لیے شراب لاتے تب یا کبھی کبھار شادیوں میں پیتے تھے۔ اب تو وہ روز ہی پی کر آتے تھے۔ یہ اچّھا نہیں تھا، پر میں کر کیا سکتی تھی۔ایسے میں بہتر یہی تھاکہ ''سب کچھ اچّھا بھلا ہے'' مان کرچلا جائے۔

لُنگی پہننے کے بعد اچّن باورچی خانے کی طرف گئے۔ میں بھی ان کے پیچھے چلی گئی۔

''تم نے کھانا کھا لیا؟'' انھوں نے پوچھا۔

''نہیں، آپ کا انتظارکررہی تھی۔''

''میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ اِس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اپنی ماں کے ساتھ کھا لیا کرو۔ یہی ٹھیک ہے، کیا انھوں نے کھا لیا؟''

اُن کی آواز کچھ ایسی تھی کہ مجھے رنجیدہ کر گئی۔''آپ کو اُن کی فکر کیسے ہو نے لگی؟ وہ ٹھیک سے کھائے یاپیئے۔ یہ خیال آپ کب سے کرنے لگے؟''

انھوں نے سر جھکالیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ میں جانتی تھی کہ میں نے اُن کا دل دکھایا ہے۔ مجھے برا لگنے لگا اورمیں نے فوراً کہا،'' آج وہ اٹھی تھی، صبح نہائی بھی تھی۔''

انھوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور بولے''چلو دیکھتے ہیں، اُسے کیا کھانا ہے؟''

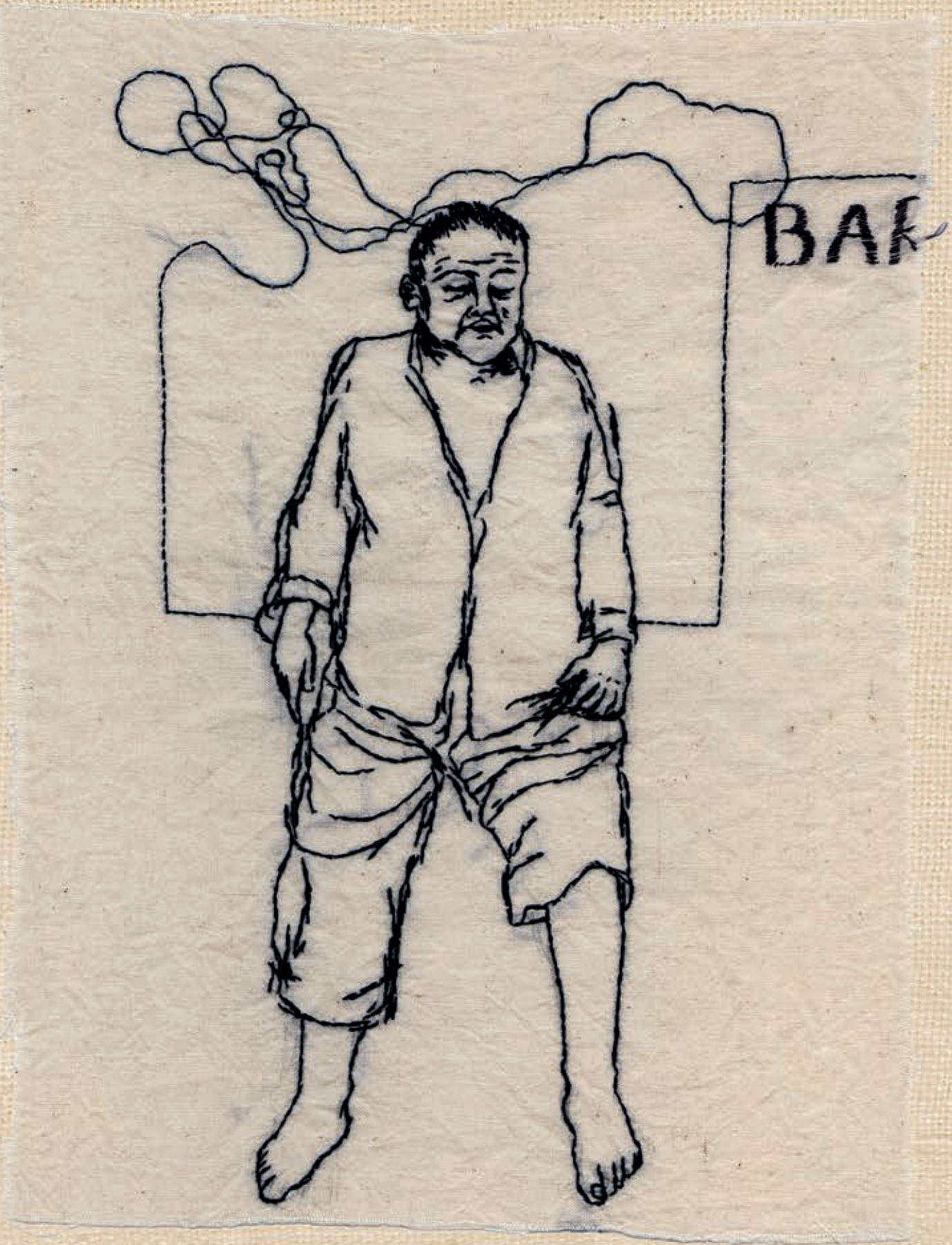
BAR

ہم اُن کے کمرے میں گئے۔ وہ دوا کھا کر گہری نیند میں جا چکی تھیں۔ اَچّن اُنھیں دیکھتے وہیں کھڑے رہے۔ پھر دھیمی آواز میں بولے ”بے چاری، کاش کہ میں....“

اور وہ چُپ ہوگئے۔میں سوچنے لگی کہ وہ کیا چاہتے تھے...میں جانتی تھی کہ میں کیا چاہتی ہوں۔ میں چاہتی تھی کہ سجی چیچی کو واپس لے آؤں۔ تب سب کچھ ویسا ہی ہوجائے گا جیسا پہلے تھا۔ اَچّن اور امّاں کام پر جائیں اور واپس آکر ہمارے ساتھ ہنسیں کھیلیں۔ امّاں میرا خط سدھارنے میں میری مدد کریں اور میں ڈیزی کے نئے کارناموں کے متعلق اَچّن سے بات کر سکوں۔ گرمیوں کی چھٹّیوں کے پہلے ہی دن اُکتاہٹ محسوس کرنے کے باوجود سجی چیچی اور میں طے کرنے میں لگے ہوتے کہ کب، کیا اور کیسے کرنا ہے۔

یہ سارے خیال اِس تیزی سے آئے کہ میں روپڑی۔ خود کو روک نہ سکی۔ اَچّن نے مجھے گود میں اُٹھایا اور تھپ تھپاتے ہوئے کُرسی پر بیٹھ گئے۔ ”میری بچّی“ کہتے ہوئے وہ دیر تک مجھے جھلاتے رہے۔ رونا بند ہوا تو لگا جیسے میں واقعی چھوٹی بچّی بن گئی ہوں۔ تھوڑی شرم بھی آئی کہ بے کار ہی اَچّن کا موڈ خراب کیا۔ کبھی کبھار ہی تو وہ شام کو جلدی گھر آتے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد اَچّن نے مجھے بستر پر سُلا دیا۔ میں نیند کی چادر اوڑھے سو رہی تھی کہ سیگریٹ کے دھوئیں کی بوآئی۔ شاید وہ چمپک کے پیڑ کے نیچے اکیلے سیگریٹ پیتے اور روتے ہوئے بیٹھے ہوں گے۔

آج کے دن کی شروعات بہت اچّھی تھی۔ مجھ سے پہلے امّاں جاگ گئی تھیں اور کچھ کر رہی تھیں۔ اَچّن نے ہمارے ساتھ ناشتہ کیا۔ دونوں نے ایک دوسرے سے کچھ زیادہ باتیں نہیں کیں۔ میں نے ماحول کو اچّھا بنائے رکھنے کی کوشش میں رشیدہ کے ’ارناکولم‘ جانے کے بارے میں اور جادوئی لڑکی ڈیزی کی اپنی نئی کہانی کے بارے میں بتایا ۔ میں نے انھیں بتایا کہ اب میرا اگلا کام باغیچے کی صفائی ہے پر وہ کچھ نہیں بولے ۔بس سر ہلاتے اور مُسکراتے رہے۔

پھر میں نے بوری والے کے بارے میں بتایا کہ وہ کھانے کے لیے آیا تھا۔ یہ سُنتے ہی اَچّن کے کان کھڑے ہوگئے۔

”کیا! اُس نے کچھ کہا؟“ انھوں نے پوچھا۔

”نہیں۔ وہ بس کھایا اور چلا گیا۔“

”ویسے تو وہ کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ پھر بھی اُس کے نزدیک مت جانا۔ کھانا دو، فوراً اندر آجاؤ اور دروازہ بند کرلو۔“

ناشتے کے بعد میں رشیدہ کے گھر کی طرف دوڑ پڑی۔ 'ارناکولم' جانے سے پہلے میں اُس سے ملنا چاہتی تھی۔ میں نے اس سے 'بلراما' کا سارا مجموعہ مانگ لیا۔ جب وہ یہاں نہیں رہے گی تو میرے پاس پڑھنے کے لیے بہت سارا مواد ہوگا۔ اُس نے اُن کے ساتھ روسی کہانیوں کی ایک رنگین کتاب بھی جھولے میں رکھ دی۔ یہ پھٹی ہوئی کتاب اسے اس کے بھائی نے دی تھی۔ اس کا سرورق بھی نہیں تھا پر دلچسپ معلوم ہو رہی تھی۔ میں نے رشیدہ سے رخصت لی اور کتابوں کا بھاری بھرکم جھولا اٹھا کر گھر کی طرف چل دی۔ گھر میں میں نے دیکھا کہ ابھی بھی امّاں جاگی ہوئی ہیں۔ میں نے پوچھ لیا میرے ساتھ باغیچہ صاف کرنا ہے؟

کتابوں کا مطالعہ کرنے اور کہانیاں لکھنے کے بعد میرا اگلا پسندیدہ کام باغبانی تھا۔ پہلے امّاں، سجی چیچی اور میں تینوں مل کر باغ میں کام کرتے تھے۔ اَچّن کو اس میں کچھ خاص مزا نہیں آتا تھا، مگر وہ ہمارے لیے اپنے دوستوں کے گھروں سے قلمیں اور بیج لے آتے تھے۔ گھر کے سامنے والے باڑ میں گلاب، گڈھیل ،گلہڑ، موگرا، 'من دارم'، 'تیچّی' اور 'اوڈچوٹی' کے پودے تھے۔ اس کے علاوہ ٹماٹر، پھلّیاں، بھینڈی اور مرچ بھی تھی۔

باغیچہ میں جنگلی گھاس اُگ گئی تھی۔ امّاں ٹھیک ہوتیں تو ایسا نہیں ہونے دیتیں۔ مگر آج وہ صرف برآمدے میں بیٹھے مجھے گھاس کاٹتے دیکھتی رہیں۔

اُس کے بعد امّاں اور میں نے رَسَم چاول کھایا۔ دوپہر میں دوبارہ میں نے روسی کہانیوں کا مطالعہ کیا۔ جس میں ایک لڑکے اور سالمن مچھلی کی کہانی تھی۔ اس لڑکے کے والدین نہیں تھے۔ وہ اپنی چاچی کے ساتھ رہتا تھا جو اس پر بہت ظلم ڈھاتی تھی اور اُس سے گھر کا سارا کام کرواتی تھی۔ ایک دن اُس لڑکے نے سمندر سے سالمن مچھلی پکڑی۔ سالمن نے کہا ''اگر تم مجھے چھوڑ دو تو میں تمہیں کچھ خاص طاقتیں دوں گی۔'' لڑکے نے مچھلی کو واپس پانی میں چھوڑ دیا۔ جب اُس کو کچھ حاجت ہوتی تو وہ کہتا، ''یہ میری مرضی اور سالمن کا حکم ہے'' اور پھر وہ پوری ہوجاتی۔وہ کہتا'' یہ میری مرضی اور سالمن کا حکم ہے کہ سارے گھڑے پانی سے بھر جائیں۔'' اب اسے برف سے ڈھکے پہاڑوں سے پانی نہیں ڈھونا پڑتا۔ اِس طرح چاچی اب اس سے ناراض نہیں ہوتی تھی۔

میری خواہش تھی کہ میں بھی ایسی کہانیاں لکھوں۔ پر میری ہیروئن ڈیزی ابھی بھی میری کتاب کے صفحہ نمبر تینتیس پر کچھ کیے بغیر بیٹھی تھی۔ کاش مجھے بھی سالمن مچھلی جادوئی طاقتیں دے جاتی لیکن میں نے تو ابھی تک کوئی سالمن دیکھی بھی نہیں تھی۔

شام کو امّاں نے کہا کہ اُنھیں بہت تھکان محسوس ہورہی ہے اور پھر وہ سونے چلی گئی۔ میں نے خوب سوچا کہ ایسا کیا کروں کہ وہ میرے ساتھ دیر تک رہیں مگر کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ سجی چیچی کو معلوم تھا کہ ایسے موقعوں پر کیا کیاجانا چاہیے۔ امّاں اگر بیمار نہ ہوں تب وہ دن میں سوتی بھی نہیں تھیں اور وہ بیمار ہوتی نہیں تھیں۔ چلو، اِتنی تو تسلّی ہے کہ آج تقریباً پورے دن وہ نہیں سوئی۔

سات بجے کے قریب میں نے باورچی خانے کی کھڑکی سے باہر جھانکا۔ بوری والا کہیں نظر نہیں آیا۔ میں نے اس کے لیے ایک پلیٹ میں کھانا نکال کر رکھ دیا تھا۔ جیسے ہی میں نے ٹی.وی. دیکھنا چاہا، اُس کی آواز سنائی دی۔

میں نے دروازہ کھولا اورپلیٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے کھانا اپنی پلیٹ میں ڈال لیا اوروہیں بیٹھ کر کھانے لگا۔ میں دروازے کے پاس ہی اندر کی جانب دو چار گز دوربیٹھ کر اُسے دیکھ رہی تھی۔ کھانے کے بعد اس نے کہا ''تم اتیتا ہی ہو نہ؟''

میں نے کہا ''ہاں، پر سب مجھے انّو بُلاتے ہیں۔''

''میں تم کو انّوکٹّی بلاؤں گا۔'' اُس نے کہا ''تم کتنے سال کی ہو؟''

''میں تین مہینے بعد گیارہ سال کی ہو جاؤں گی۔''

''تمہیں میرا نام معلوم ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''بوری... نہیں'' میں نے کہا۔ ''مجھے نہیں معلوم۔''

وہ مسکرایا۔ ''سب مجھے بوری والا پکارتے ہیں مگر یہ میرا نام نہیں۔ میرا نام نارائینن ہے۔''

نارائینن! بڑی امّاں کے شوہر کا بھی یہی نام تھا۔ بوری والے کے لیے نارائینن کا نام عجیب لگ رہاتھا۔ میں اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی پر سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ پوچھوں یا نہیں۔ کچھ وقت کے بعد سوچا کہ پوچھ ہی لیتی ہوں۔

''تمہارا گھر نہیں ہے؟تمہارا گھر کہاں ہے؟''

''ہوں...گھر'' بوری والے نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ ''ہوتا تھا میرا ایک گھر پر اب نہیں ہے۔''

''کیوں نہیں ہے؟''

بوری والا۔ نہیں، نارائینن۔ تھوڑی دیر کے لیے کچھ نہیں بولا۔ بس اپنی پلیٹ کو گھورتا رہا۔ ''کبھی کبھی گھر سب سے اچّھی جگہ نہیں ہوتی۔'' اُس نے کہا۔پھر اس نے ایک گہری سانس لی اور مجھے دیکھنے لگا۔

''تمہاری امّاں اور اَچّن کہاں ہیں؟''

”اچّن ابھی تک نہیں آئے اور امّاں بیمار ہیں،سو رہی ہیں۔“

”کیا ہوا اُنھیں؟“

مجھے سمجھ میں نہیں آیا کہ سجی چیچی کی موت کے بارے میں بتاؤں یا نہیں۔ جب بھی سجی چیچی کا ذِکر آتا تھا لوگ سرگوشیاں کرنے لگتے تھے۔”وہ غمگیں ہیں،“ میں بولی۔

”کیا ہم سبھی کبھی نہ کبھی غمگیں نہیں ہوتے؟“ وہ بولا۔ ”تم ان کا خیال رکھ رہی ہو نا؟ تم تو بہت بہادر لڑکی ہو۔“

وہ مجھے بہادر سمجھتا ہے سُن کر میں بہت خوش ہوئی۔”بس وہ تو ....“ میں نے کہنا شروع کیا۔” میں تو یہی چاہتی ہوں کہ وہ کام پر جائیں، میرے ساتھ کھیلیں۔ بس سب کچھ پہلے جیسا ہو جائے۔“

بوری والے نے کھانا ختم کیا اور دیوار سے ٹیک لگا کر پانی پینے لگا۔ ”ہاں ...ہوتا ہے کبھی کبھی۔ اُداسی کئی دنوں تک نہیں جاتی۔ پر تم دیکھنا جلد ہی وہ ٹھیک ہو جائیں گی۔“

اُس کی آواز بہت دھیمی تھی۔ کبھی تو سنائی ہی نہیں دیتی تھی۔میں نے اُسے رشیدہ کے دادا سے باتیں کرتے دیکھا تھامگر میں تو اُس سے پہلی بار بات کر رہی تھی۔ اِس سے پہلے میں نے اس کی آواز تک نہیں سنی تھی۔

”تمہارے بچّے ہیں؟“ کچھ دیر بعد میں نے پوچھا۔

”ہاں ہے...ایک بیٹا -چھوٹا ہے، اس کا نام سُومن ہے۔“ پھر وہ سر ہِلا کر ہنسنے لگا۔”پر شاید اب وہ اتنا چھوٹا نہیں رہا۔ میں نے اُسے عرصے سے نہیں دیکھا۔“

مجھے یاد آیا، جب اَچّن دوبئی گئے تھے تو سجی چیچی اور مجھے اُن کی بہت یاد آتی تھی۔ وہ بھی ہماری جدائی برداشت نہیں کر سکے اور تین مہینوں میں ہی واپس آ گئے تھے۔

”تمہیں بھی افسوس ہوتا ہوگا!“ میں نے کہا، ”تم اپنے گھر جاکر اُس سے مل کیوں نہیں لیتے؟“

بوری والا کھڑا ہوگیا۔ ”رات ہو رہی ہے“ وہ بولا۔”اب تم اِندر جاؤ۔“ اپنی پلیٹ اور مگ اُٹھاکر وہ اندھیرے میں گُم ہوگیا۔

مجھے معلوم تھا میرے سوالوں نے اسے غمگیں کردیا۔مگر میں اس کے بارے میں اور زیادہ جاننا چاہتی تھی کہ وہ ٹاٹ کے ٹکڑے سی کر کیوں پہنتا تھا؟ وہ گھر کیوں نہیں جانا چاہتا تھا؟ اور پوسٹ آفس کے برآمدے میں اکیلے بیٹھے وہ کیا سوچتا رہتا تھا؟ یہ سب میں اَچّن کا انتظار کرتے ہوئے سوچتی رہی۔ آج انھیں بہت دیرہوگئی تھی۔ ساڑھے دس بجے تک میں جاگتی رہی اورپھرسوگئی۔

اُس دن کے بعد سے بوری والا تقریباً ہر روز ہی آنے لگا تھا۔میں اُسے کھانا دیتی اور پھر ہم باتیں کرتے۔ دو تین بار جب وہ آیاتو اَچّن گھر پر ہی تھے۔تب میں کھانا دے کر جلد دروازہ بند کر دیتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ میرا اُس سے بات کرنا اَچّن کواچھا نہیں لگتا تھا۔ ایسا نہیں کہ انھوں نے مجھے ڈانٹا ہویا اُس سے بات نہ کرنے کو کہا ہو۔میں جانتی تھی کہ انھیں میری فکر تھی۔ مجھے ڈر لگتا تھاکہ بوری والے سے باتیں کرتے دیکھ کر اَچّن کہیں اُسے ہمارے گھر آنے سے روک نہ دیں۔

عام طورپر بوری والا زیادہ باتیں نہیں کرتا تھا۔ میں خاموشی سے بیٹھ جاتی اور اُسے کھانا کھاتے دیکھتی رہتی، درمیان میں وہ کچھ کہہ دیتا یا پوچھ لیتا۔بوری والابڑےلوگوں کی طرح تھا۔ اگر آپ کچھ پوچھیں جس کا جواب وہ نہیں دینا چاہتا تو کہہ دیتا،''تُم نہیں سمجھوگی ،ابھی چھوٹی ہو۔''اِس کے آگے بات بڑھانے کا کوئی مطلب ہی نہیں رہ جاتا تھا۔

جب اس کا بات کرنے کا ارادہ ہوتا تو وہ اپنے بیٹے سُومن کے بارے میں بتاتاکہ کیسے اسکول کے پہلے دن وہ پورا راستہ روتا رہا،کیسے ریاضی میں امتیازی نشانات لانے والا لڑکا ایک لفظ بھی صحیح نہیں لکھ سکتاتھا۔ بدلے میں، میں سجی چیچی کے بارے میں کچھ بتاتی کہ مجھے ان کی کتنی یاد آتی ہے۔ اپنےخراب خط اور لوگوں کی سرگوشیوں کی وجہ سے مجھے اسکول جانا کتنا خراب لگتا ہے۔ میں پھر بوری والے کے ساتھ ہونے والی گفتگو کو لکھنے لگی۔ اب بوری والے کے بجائے اس کا نام نارائینن لکھتی ہوں۔

ایک دن اس نے اپنی جیپ کارکے بارے میں بتایا۔ پورے ضلع میں صرف اُس کے پاس ہی جیپ چلانے کا لائسینس تھا۔ 'کلشیری' کے گھماؤدارراستوں میں برق رفتار گاڑی چلانے کے واقعہ کے بارے میں بتاتے ہوئے اُس کی آنکھیں چمک اٹھتیں اور پھر ایک دن اس کا حادثہ ہوگیا۔

''کیسے؟''میں نے پوچھا۔

بوری والا بہت غمگیں ہوگیا۔ اُس کی سانسیں تیزہوگئیں۔ وہ کچھ کہہ رہاتھا جسے میں مشکل سے سُن پا رہی تھی۔

''آوازیں،'' اس نے کہا،''اُوہ! وہ آوازیں....''

میں اُسے دلاسا دینے کی کوشش کرنے لگی کہ سب ٹھیک ہے اور اُسے پینے کے لئے پانی دیا۔ ہم دونوں کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ اٹھا اور کچھ کہے بغیر چلا گیا۔

حادثے کی بات نے اسے خوفزدہ کردیاتھا۔ میں بھی پریشان ہوگئی تھی اور اَچّن سے اُس کے بارے میں پوچھنا چاہتی تھی لیکن اگر میں ان سے پوچھتی تو وہ یقیناً بہت غصّہ کرتے۔ اگلی بار جب بوری والا آیا تو وہ پہلے کی طرح خاموش بیٹھا رہا۔ اَچّن سے میں نے اس کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

پھر ایک دن وہ نہیں آیا۔ میں انتظار کرتی رہی اور کرتی رہی۔ اگلے دن بھی وہ نہیں آیا اور پھر اس کے اگلے دن بھی نہیں۔اگلی صبح پوسٹ آفس کے برآمدے پر میں اسے ڈھونڈنے گئی جہاں وہ سوتا تھا، مگر وہاں اس کا نام ونشاں تک نہیں تھا۔

رشیدہ اپنے رشتے دار کے گھر سے واپس آگئی تھی۔میں اُس کے گھر گئی اور ہم دونوں مِل کر دوبارہ پوسٹ آفس گئے۔ اَمّنی امّاں تمام خطوط صدر پوسٹ آفس بھیجنے کے لیے جمع کررہی تھیں۔کبھی کبھی وہ ڈاک کو سیل کرنے والی لاک کے بچے کُچے ٹکڑے ہمیں دے دیتی تھیں۔ ہم نے کھڑکی سے کچھ اس طرح جھانکا جیسے ہم لاک کے ٹکڑے لینے آئے ہیں۔

انھوں نے ہم سے وہی سوالات پوچھے جو وہ ہمیشہ پوچھتی تھیں ''چھٹیاں مزے سے گزر رہی ہیں؟ پڑھائی وڑھائی کچھ یاد ہے کہ سب بھول گئے....'' میں نے پوچھا، ''آپ نے پچھلے ایک دو دِنوں میں بوری والے کو دیکھا ہے...؟''

انھوں نے خطوط پر سے نظر اٹھاتے ہوئے کہا، ''بوری والے میں اچانک تمہاری بڑی دلچسپی کیوں جاگ گئی؟'' اپنے چشمے کے اوپرسے انھوں نے آنکھ اُٹھاکر اس طرح دیکھا کہ لگا وہاں سے بھاگنے میں ہی سمجھداری ہے۔

''کچھ خاص نہیں،'' میں جلدی سے بولی۔ ''وہ روز گھر پر کھانے کے لیے آتاتھا۔ کچھ دِنوں سے نہیں آیا تو پوچھ لیا۔''

اَمّنی امّاں اٹھیں اور کونے کی تنگ سی شیلف پر رکھے ایک چھوٹے سے ڈبّے میں کچھ ڈھونڈنے لگیں۔ ''اُس کا جی چاہا ہوگا کہ تھوڑاگھوم لے، اِس لیے چلا گیا ہوگا۔ اس کا مزاج جب اچّھانہیں ہوتا تووہ چلا جاتا ہے۔''

انھوں نے ہم دونوں کو لاک کا ایک ایک ٹکڑا دیا اور کہا ''اب بھاگ جاؤ اوربوری والے کی فکر چھوڑدو۔ یہ تم جیسے چھوٹے بچّوں کا کام نہیں ہے۔''

اب کِسی اور سے پوچھنے کا کوئی مطلب نہیں تھا۔ ہم نے سوچا کہ اب اُس کے لوٹنے کا ہی انتظار کرنا پڑے گا۔

شام کو میں اپنی کتاب پڑھتے ہوئے فرش پر لیٹی ہوئی تھی۔ میری کہانی میں ڈیزی ابھی بھی وہیں رُکی ہوئی تھی۔ رشیدہ کا واٹر ورلڈوالا قصّہ بھی مجھ میں وہ جذبہ نہیں جگاسکاکہ ڈیزی کے لیے کوئی اچّھا کارنامہ لکھ پاتی۔ مجھے محسوس ہوا کہ اگلے دو چار دن تک میں ایسا کچھ بھی نہیں کر پاؤں گی کہ جِس کو شان سے اَچّن کو دِکھاپاؤں۔ اِس لیے جب اَچّن کمرے میں آئے تو مجھے خود پر شرم آئی۔ ابھی تو سات بھی نہیں بجے تھے۔ آج اَچّن اتنی جلدی کیسے آگئے؟ وہ شراب پیئے ہوئے تھے اور ان کا موڈ کافی خراب لگ رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ میرے پاس آکر بیٹھ گئے اور ایک سیگریٹ جلایا۔ ان کی نظرمیری کاپی پر گئی۔

''پچھلے کچھ دِنوں میں کچھ لکھا ؟'' انھوں نے پوچھا۔

میں نے فوراً اپنی کاپی لے لی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ بوری والے کے بارے میں میری تحریر پڑھیں۔ میں نے کہا ''میں ڈیزی کو لے کر رُکی ہوئی ہوں۔ اُس کے پاس کر نے کوکچھ نہیں ہے۔'' اَچّن نے کہا '' کو ئی بات نہیں۔ بڑے قلم کاروں کو بھی اِس طرح کے حا لات پیش آتے ہیں۔''

اُسی وقت مجھے باہر شور و غل سنائی دیا۔ ''بوری والا!'' میں چلائی اور کود پڑی۔ اچّن نے مجھے پکڑ لیا۔

''انّو،'' انھوں نے سخت آواز میں کہا۔''اتنی اُتاولی کیوں ہو رہی ہو؟''

میں نے انھیں بتایا کہ بوری والا چند دنوں سے نہیں آیا تھا۔

''میں نے کہا تھا نا کہ اُس سے دوررہنا،'' اَچّن نے کہا۔''وہ ٹھیک نہیں ہے۔ شاید بیمار ہے۔ مادھون نے دو دن پہلے اسے 'چِلیمبرا' میں دیکھا تھااور وہ چیخ وپکار کررہاتھا۔ وہ جیساخاموش دکھتا ہے ویسا نہیں تھا۔''

''ہو سکتا ہے کہ وہ بھوک کی وجہ سے...اس نے شاید کئی دن سے کھانا نہیں کھایا ہوگا،'' میں نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

اَچّن کا پارا چڑھنے ہی والا تھا۔ ''اس کے بارے میں تمہیں فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم یہاں بیٹھو میں دیکھتا ہوں اُسے کیا چاہیے۔''

وہ باورچی خانے میں گئے اور میں نے پیچھے والا دروازہ کھولنے کی آواز سنی۔ تھوڑی دیر تک کچھ سنائی نہیں دیا۔پھر اچّن کی تیز آواز آئی، پروہ کیا بول رہےتھے سمجھ نہیں آرہا تھا۔

''وہ چلا گیاہے۔'' اچّن واپس آئے اور کہنے لگے،''پھر آئے تو دروازہ مت کھولنا، کم سے کم کچھ دِنوں تک۔''

رات میں بستر پر لیٹے سوچتی رہی کہ بوری والے کو کون کھانا دے گا۔لیٹے ہوئے ایک گھنٹہ ہوگیا تھا۔ نیند نہیں آرہی تھی تو میں امّاں کے کمرے میں چلی گئی۔شایداُنھوں نے آج اپنی دوائی لی ہوگی اس لئے گہری نیند میں تھیں۔میں نے ایک ہاتھ ان کے اوپر رکھا اور ان سے لِپٹ کر لیٹ گئی۔

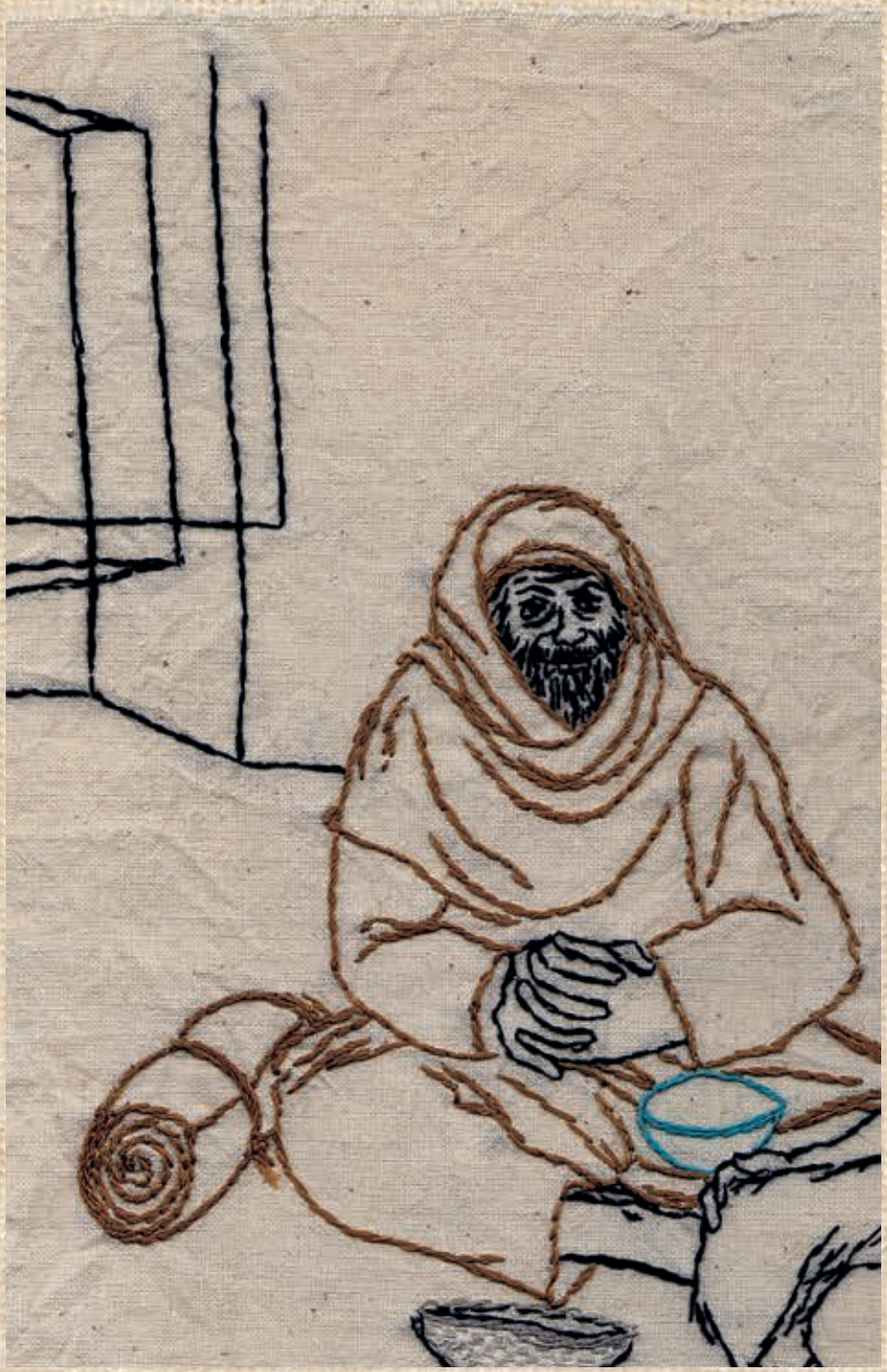

نہ جانے کب نیند لگ گئی۔ آنکھ کھلی تو دیکھا کہ چاروں طرف اَندھیرا تھا۔ میں لیٹی رہی اور کل کے بارے میں سوچتی رہی کہ بوری والے کو کیسا محسوس ہورہا ہوگا۔سوچتے ہوئے مجھے پھر نیند لگ گئی۔

صبح جب میں اٹھی اور باورچی خانے میں گئی تو وہاں بڑی امّاں تھیں۔ انھوں نے مجھے نہانے بھیج دیااورخوداماں کے کمرے میں چلی گئیں۔ میں نے دیکھاکہ وہ اُٹھنے کے لیے امّاں‌کو منا رہی تھیں۔ نہا کر میں باہر گئی تو دیکھا رگھو ماموں اور اَچّن بیٹھے کافی پی رہے ہیں۔

رگھوماموں ،اَچّن کے کزن تھے جنھیں میں رگھو ماموں بلاتی تھی۔ وہ بھارت فنون اور کھیل کلب کے صدر تھے۔ اُس کلب کو سب لوگ بی.اے.یس. کلب بھی کہتے تھے۔ اس کلب کے سبھی اراکین رگھوماموں کی طرح کالج میں پڑھاتے تھے۔ اس کلب کا دفتر پوسٹ آفس کے اوپر کے کمرے میں ہی تھا۔ ہر سال گرمیوں کی چھٹیوں میں وہ کئی پروگرام کرتے تھے۔ مثلاً دوسرے کلبوں کے ساتھ کِرکٹ یا فُٹبال کے میچ منعقد کرنا وغیرہ۔ پچھلے سال تو انھوں نے ایم. جی. شری کمار اور سُجاتاکے ساتھ مل کر ایک گانوں کا پروگرام بھی منعقد کیا تھا۔ کبھی کبھی وہ تالاب کی صفائی یا بس اسٹانڈ کے آس پاس کی دکانوں کی رنگائی و صفائی جیسے سماجی کام بھی کرتے ہیں۔

رگھوماموں اس سال کی سرگرمیوں کے بارے میں اَچّن سے گفتگو کررہے تھے۔ میں وہاں بیٹھ کر ان کی باتیں سن رہی تھی۔

”اِس سال بہت کم پیسے جمع ہوئے ہیں،“ رگھوماموں کہہ رہے تھے۔ ”آج کل کوئی پیسے دینا ہی نہیں چاہتا۔ مجھے نہیں لگتا اس بار کوئی کھیل یا ثقافتی پروگرام ہو پائے گا۔“

”تو پھر کیا کرنے کی سوچ رہے ہیں؟“ اَچّن نے پوچھا۔

”اس سال کچھ سماجی کام کرنے کا سوچ رہے ہیں۔سوچ رہے ہیں کہ بوری والے کو علاج کے لیے ’کوڈیراوٹّم‘ لے جائیں گے۔“

”یہ کتنی شرم کی بات ہے،“ رگھوماموں کافی کا گھونٹ پیتے ہوئے بولے۔ ”وہ بیمارہے اور اِدھر اُدھر گھومتا رہے اور ہم ہاتھ پہ ہاتھ دھرے دیکھتے رہیں اسے علاج کی ضرورت ہے۔“

”پر کیا وہ تمہارے ساتھ چلے گا؟“ اَچّن نے پوچھا۔

”دیکھتے ہیں، اسے سمجھانا پڑے گا۔ یہ اُسی کے لیے اچّھاہے۔ ہم نے ’کوڈیراوٹّم ہسپتال‘ میں ایک ماہرنفسیات سے بات کر لی ہے۔ گلی محلوں میں گھومنے والے پاگلوں کے لیے ان کا ایک پروگرام ہے۔“

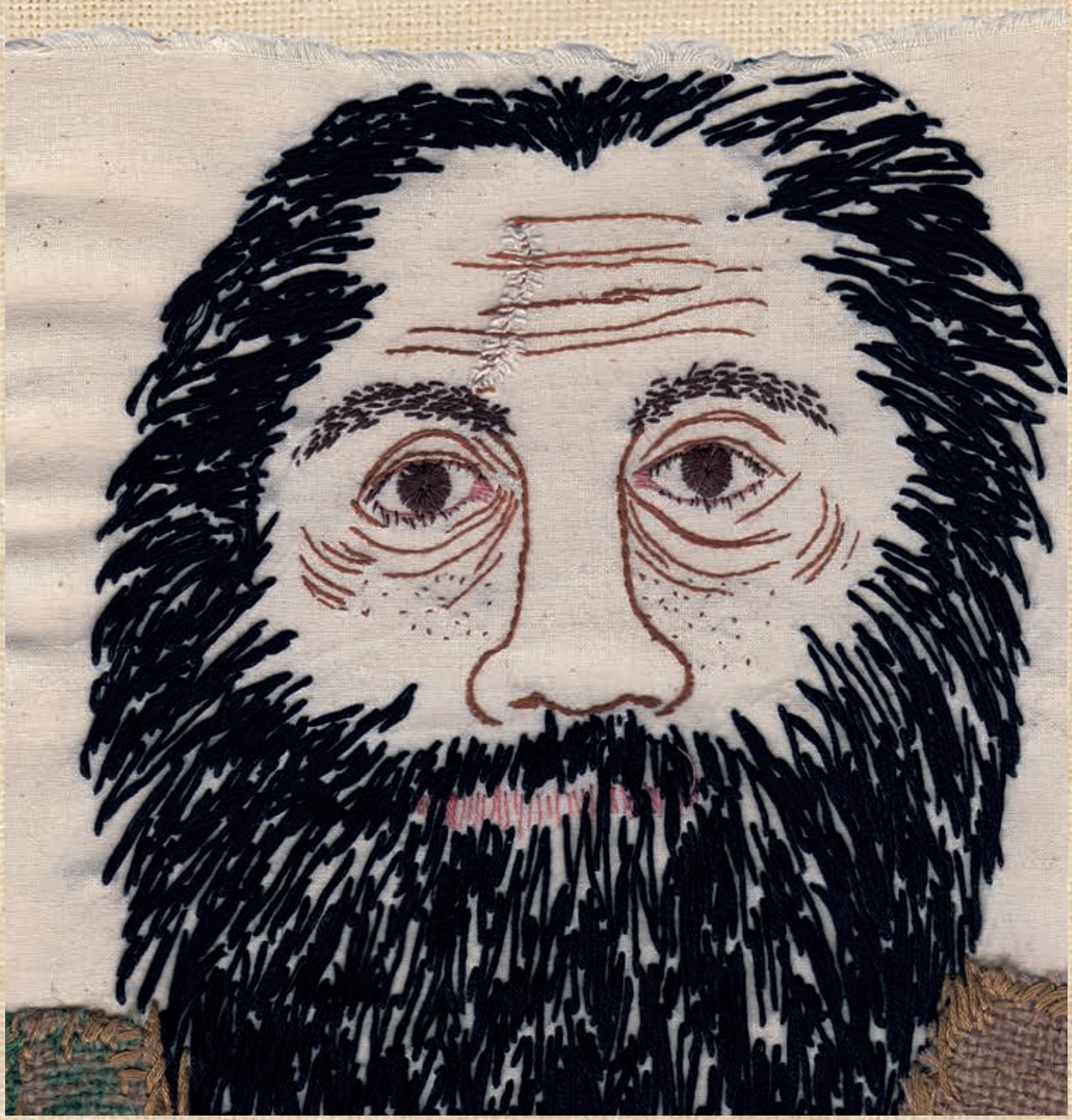

اچّن نے میری طرف دیکھا۔ ”انّو ذرا اندر جاکر دیکھو تو سہی کہ ناشتہ تیّار ہوا کہ نہیں۔“ میں جانتی تھی، وہ نہیں چاہتے تھے کہ میں بوری والے کے بارے میں ان کی باتیں سنوں۔ اس لیے بہانہ بنا کر وہاں سے مجھے بھیج دیا۔

میں اٹھی اور اندر چلی گئی۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہاتھا ...ہوسکتا ہے رگھوماموں ہی صحیح ہوں کہ بوری والے کو علاج کی ضرورت ہے۔ پربھاکرن ڈاکٹر کی دوا سے تو امّاں اور زیادہ اُداس اورزیادہ سونے لگی ہیں۔ مجھے تو وہ صحت یاب ہوتی نظر نہیں آتیں۔کاش کوئی مجھے اِن چیزوں کے بارے میں سمجھاتا۔ اگر سجی چیچی یہاں ہوتی تووہ ضرور مجھے بتاتیں۔

میں پوری صُبح مُنھ لٹکائے اِدھر اُدھر گھومتی رہی۔ آخر میں بڑی امّاں کا صبر جاتا رہا اور انھوں نے مجھے کھیلنے کے لیے رشیدہ کے گھر بھیج دیا۔

وہ ہفتے کا دن تھا۔ کام پر جانے سے پہلے اچّن نے مجھ سے سختی سے کہا کہ آج میں بالکل گھر سے باہر نہ نکلوں، آج بی.اے.ایس. کے لوگ بوری والے کو تالاب پر لے جانے والے ہیں تاکہ اسے ’کوڈیراوٹّم‘ لے جانے کے لیے تیّارکرسکیں۔ رشیدہ دس بجے آئی اورہم چمپک کے پیڑ کے نیچے سانپ سیڑھی کھیلنے لگے۔میرے ایسے ہی نمبر آتے رہے جو مجھے سیدھے سانپ کے منھ میں پہنچاتے رہے۔

اسی وقت میں نے رگھو ماموں اور ان کے دوستوں کو دیکھا۔ ان کے ساتھ ان کی کرکٹ ٹیم کے وکیٹ کیپر حمید بھائی، ویڈیو کی دکان والا دلیپن اور کچھ اورلوگ تھے جنھیں ہم نہیں جانتے تھے۔ ہم دوڑتے ہوئے گیٹ پر گئے، پھرسڑک پار کرکے پوسٹ آفس پہنچ گئے۔

وہاں ایک کونے میں بوری والا بیٹھاتھا۔ بھیڑ کو دیکھتے ہی وہ اُٹھا اور اُس نے اپنے تھیلے کو کس کر پکڑ لیا۔ رگھوماموں سیڑھی چڑھ کربرآمدے میں پہنچے اور بوری والے سے کہا،”چلو ہمارے ساتھ۔ ہم سب تالاب میں ایک ساتھ نہائیں گے۔“

بوری والے نے بھاگنے کی کوشش کی مگر لوگوں نے اُسے پکڑ لیا۔ رگھوماموں نے تولیہ سے اس کے دونوں ہاتھ اس کی پیٹھ کے پیچھے باندھ دیئے۔ پھر وہ کبھی کھینچتے، کبھی ڈھکیلتے، کبھی اس کے ساتھ چلتے اسے تالاب تک لے آئے۔ مجھے اُس کی سِسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ بوری والا بغیرکچھ کہے روتا جارہاتھا۔

رشیدہ اور میں اُن کے پیچھے بھاگے۔ سڑک پر سبھی لوگ اُسی طرف بھاگ رہے تھے۔جلد ہی وہاں بھیڑ لگ گئی۔ وہ اُسے تالاب کی مشرقی سمت میں نیچے لے گئے اور اسے ایک سیڑھی پر بیٹھا دیا۔کچھ لوگوں نے اسے جکڑ لیا اور رگھوماموں اور حمید بھائی اس کے بال کاٹنے لگے۔ بالوں کے گچھے اس کے چاروں طرف گر رہے تھے۔ اسے گنجا کر دیا گیا تھا۔

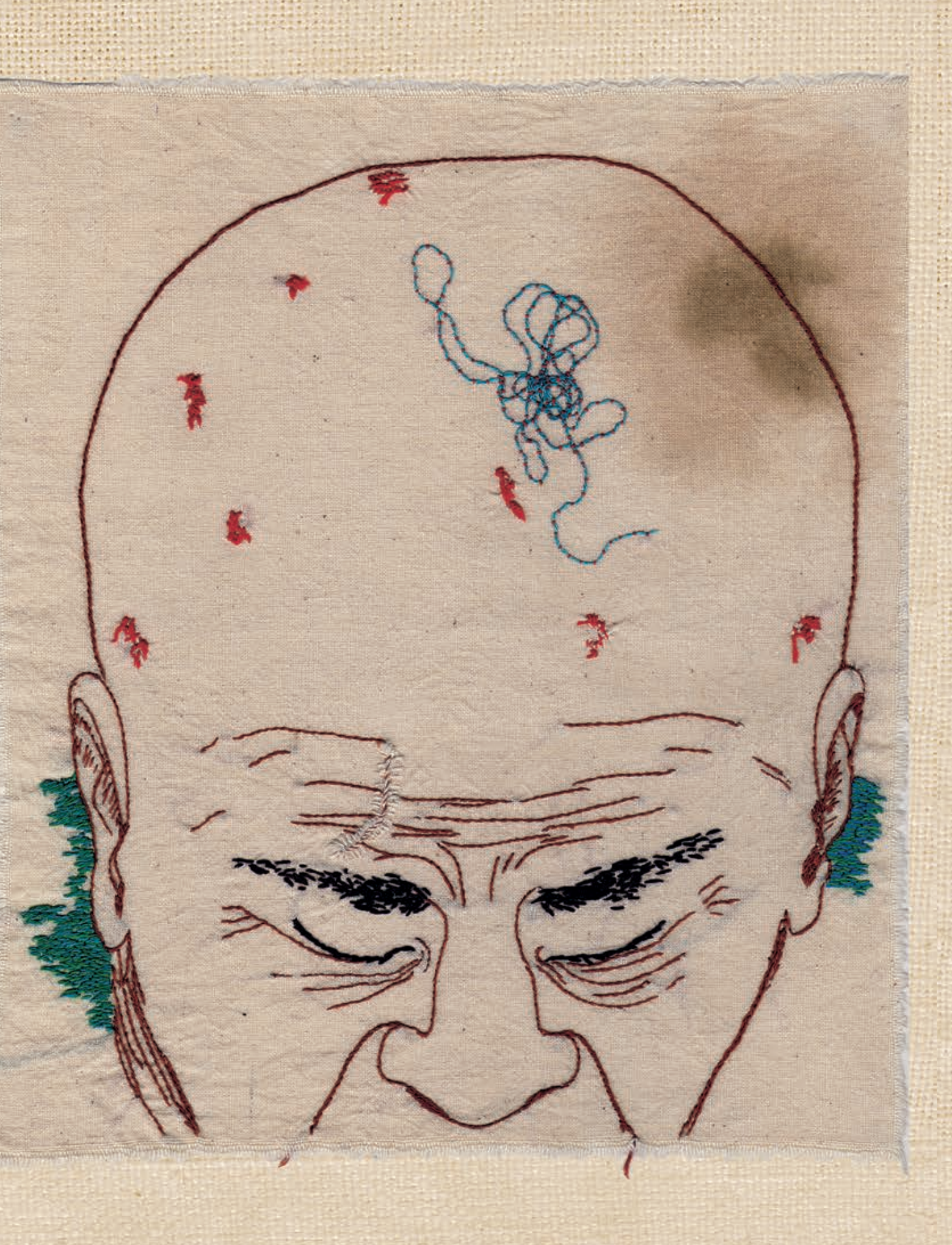

تبھی ہمیں کسی کی تیز آواز سنائی دی ”تم دونوں یہاں کیا کررہی ہو؟“ ہم نے پلٹ کر دیکھا۔ وہاں رشیدہ کے داداجان کھڑے تھے۔وہ غصے میں بولے ”تم لوگوں کا یہاں کیا کام؟گھر جاؤ۔ ابھی....“

”دادا...“ رشیدہ نے بولنا شروع ہی کیا تھا کہ وہ چلائے ”چپ رہو! گھر جاؤ... نہیں تو ...آؤ میں خود تمہیں لے جاتا ہوں۔“

اُن سے کچھ کہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ رشیدہ کے داداجان ہمارے ساتھ گھر تک آئے۔ وہ تب تک کھڑے رہے جب تک ہم اندر نہیں چلے گئے۔ ہم نے ٹی.وی. لگایا۔ سوریا چینل میں جےرام کی ایک فلم چل رہی تھی۔ ہم اُسے دیکھتے رہے پر ہماری توّجہ وہاں نہیں تھی۔ ہم بوری والے کے بارے میں بات کرتے رہے کہ وہ ٹھیک ہوگا کہ نہیں....

تقریباً چار بج رہے تھے، جب میں اپنے گھر کے لیے نکلی۔ سڑک خالی ہو چکی تھی اورسب کچھ خاموش لگ رہاتھا۔

شایدامّنی امّاں تین بجے پوسٹ آفس بند کرکے گھر چلی گئی۔ میں نے سوچا ،دیکھوں کہ بوری والا وہیں تو نہیں بیٹھاہے۔

مجھے دیکھتے ہی وہ کونے میں دبُک گیا۔وہ میری طرف دیکھنے سے جھجک رہا تھا۔ وہ کچھ الگ لگ رہاتھا۔وہ بھوری دھاریوں‌والا پاجامہ اور سبز رنگ کی قمیص پہنے ہوئے تھا۔ اس کے آس پاس کہیں بھی تھیلے کے ٹکڑے نہیں تھے۔ اس کے سامنے پلیٹ میں چاول اور سبزی رکھی تھی،پر اُس نے اسے ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔

پر اس کا چہرہ...اور اس کا سر...اس کے سر، منھ اور ٹھوڑی پر اب بال نہیں تھے۔ ایسا لگ رہاتھا جیسے اُسترے سے اس کی چڑی جگہ جگہ سے چھیل گئی تھی۔ وہاں خون لگا تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ کی کہنی پر چھیلنے کے نشان تھے جیسے اس نے اپنے ہاتھ کو کسی کھردرے پتھر پررگڑا ہو۔

میں برآمدے پر چڑھ کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ ”تم ٹھیک ہو نہ؟درد ہورہاہے کیا؟“ میں نے پوچھا۔

وہ سر جھکا کے بیٹھا تھا۔ جب میں نے اس کی کہنی کو چھونے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو وہ کونے میں تھوڑا اورکھسک گیا۔ ”سنو، تم دوا خانہ چلےجاؤ۔میں نے سُناہے وہ بہت اچھادوا خانہ ہے،“ میں نے کہا۔

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا جیسے اُس نے سناہی نہ ہو۔ سمجھ میں نہیں آرہاتھاکہ اُس سے کیا کہوں۔ ”ہو سکتاہے تم ٹھیک ہوجاؤ۔ پھر تم سومن کے پاس جاسکتے ہو۔“

اِس کے بعد میں وہیں بیٹھی رہی۔ بوری والے نے مجھے دیکھا تک نہیں۔ اب مجھے فکر ہونے لگی تھی۔ اس لیے کہ اب لوگ کام سے گھروں کی طرف واپس ہو رہے تھے اور کوئی آچّن سے کہہ سکتا تھا کہ اس نے مجھے بوری والے کے قریب بیٹھے دیکھا تھا۔

میں اسے وہیں چھوڑکر گھر چلی آئی۔ اُس شام وہ گھر نہیں آیا۔ میں نے اِس کی امید بھی نہیں کی تھی۔اُس رات میں اکیلے سونا نہیں چاہتی تھی اِس لیے امّاں کے بستر پر اُن کے ساتھ لیٹ گئی۔ انھیں اس کے ساتھ زبردستی کرنے کی کیا ضرورت تھی وہ کسی کو نقصان تو نہیں پہنچا رہاتھا۔ بس وہ وہاں خاموش بیٹھا رہتایا اِدھر، اُدھر گھومتا رہتا اورجو ملتا وہ کھا لیتاتھا۔ کاش کہ کوئی مجھے بتاسکتا لیکن مجھ سے بات کرنے والا وہاں کوئی نہ تھا۔

اگلے دِن جب بڑی امّاں میرے بالوں میں تیل لگا رہی تھی تب ہی میں نے باہر شور و غل کی آواز سُنی۔ میں اُن کے ہاتھوں کے بیچ سے کِھسک کر باہر بھاگ گئی۔پوسٹ آفس کے سامنے مجمع لگا ہوا تھا۔میں نے اَچّن کی آواز سُنی۔وہ مجھے واپس آنے کے لیے کہہ رہے تھے،پر میں اَن سنی کرکے بھاگ نکلی۔

بوری والا بھیڑ سے گھِرا ہوا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک ڈنڈا تھا جسے وہ چاروں طرف گول گول گھما رہا تھا۔بی .اے .ایس .کے آدمی اسے پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہاں شور و غل مچا ہوا تھا۔ سبھی لوگ چیخ وپکار رہے تھے۔"پکڑو اسے!" کوئی بولا۔ "اس کے ڈنڈے سے بچ کے رہنا۔" "ڈنڈا چھین لواس کا۔" بوری والا چیخ رہا تھا۔ اس نے تیز ی سے ڈنڈے کو چاروں طرف اِس طرح گھمایا کہ کوئی نزدیک آئے تو اس کا سر پھٹ جائے۔

تبھی پیچھے سے بوری والے کو دھکّالگا اور وہ گرگیا۔ اچانک ہلچل بڑھ گئی۔ دوتین آدمی اس پر ٹوٹ پڑے اور زمین پر گرا کر اسے دبوچ لیا۔ رگھوماموں نے اس کے ہاتھ اس کی پیٹھ کے پیچھے کیا اور کسی نے اُسے رسّی سے باندھ کر کھڑا کر دیا۔

مجھ سے یہ سب برداشت نہیں ہورہا تھا۔ میں رگھوماموں کی طرف بھاگی اور ان کے ہاتھ کھینچتی ہوئی چلائی، "اسے چھوڑ دو!جانے دو اسے! تم اسے کیوں تکلیف پہنچا رہے ہو۔ وہ تمہارے ساتھ نہیں جانا چاہتا۔" رگھوماموں نے مجھے جھٹک دیااور ڈانٹ کر کہا کہ میں گھر چلی جاؤں۔ اُنھوں نے بوری والے کو اٹھایا اور جیپ میں بیٹھا دیا۔ میں دیر تک اس کا چیخنا چلاناسُنتی رہی۔ میں جیپ کے پیچھے بھاگی۔ "چھوڑ دو اسے! اسے پریشان مت کرو! جانے دو اسے!" میں چلاتی رہی۔

اچانک کسی نے مجھے اٹھا لیا۔ میں لاتیں مار رہی تھی اور نوچ رہی تھی۔ جیپ 'نیاڈیپّرا' کی پہاڑیوں کے پیچھے اُوجھل ہوتی جا رہی تھی اور میں کچھ نہیں کرپائی۔ میرا گلاسوکھنے تک میں چیختی چلاتی رہی۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا تھاکہ اَچّن یا کوئی اور کیا کہیں گے،کیا سوچیں گے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ بوری والے کو لے جائیں۔ روتے روتے میری ہِچکیاں بندھ گئیں۔ میں جتنا لڑسکتی تھی لڑی۔ اَچّن مجھے اٹھائے گھر کی طرف چلتے رہے۔

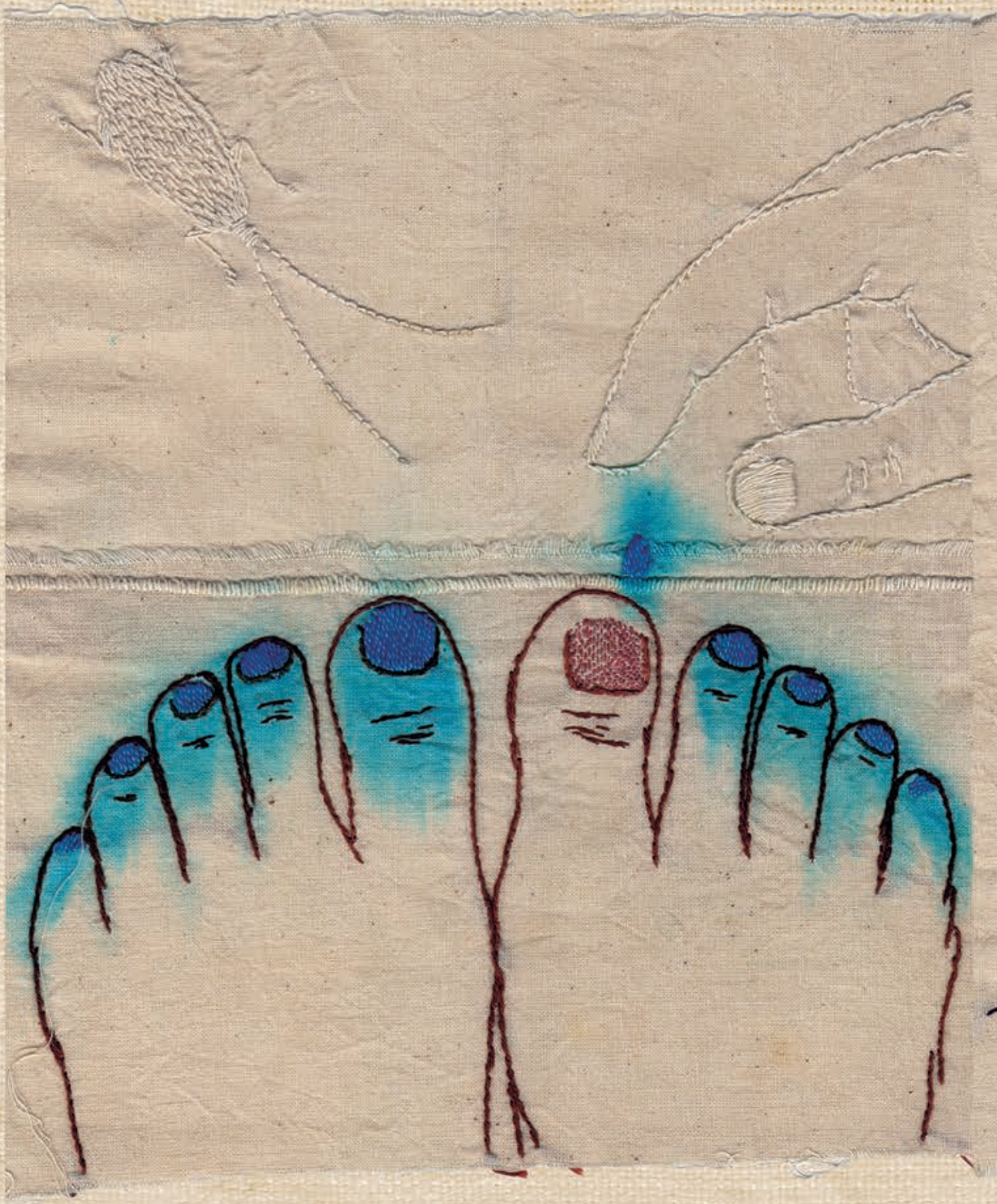

مجھے نہیں معلوم اس کے بعد کیا ہوا۔ درمیان میں ایسا محسوس ہوا جیسے میرا جسم جل رہا تھا۔ مجھے تیز پیاس بھی لگی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے پورے جسم پر جھینگر رینگ رہے ہیں۔ پھر مجھے سجی چیچی نظر آئی۔ وہ میرے پاؤں کے ناخنوں پر چمکیلی نیلی پالش لگا رہی تھی۔ پالش لگانے کے بعد ا نھوں نے پھونک کر اسے سکھانے کی کوشش کی۔ میں نے ان کے جھکے ہوئے سر کو دیکھا۔ ان کے بال اتنے کالے تھے کہ نیلے جیسے لگ رہے تھے۔

ہم نے آنکھ مچولی کھیلی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ ہماری پڑوسی مادھوی امّاں کے پیچھے والے آنگن کی بڑی جھاڑیوں میں چھپ جائے گی۔ میں نے انھیں بہت ڈھونڈا پر وہ نہیں ملی۔ جب میری آنکھ کھلی تو میں اُن کا نام لے کر چیخ رہی تھی۔ ایسا محسوس ہوا کہ کمرے میں بہت سارے لوگ ہیں، مگر وہ کہیں بھی نظر نہیں آئی۔ وہ چلی گئی تھی اور جھینگر پھر سے آگئے تھے۔

جب میں دوبارہ جاگی تو امّاں میرے پاس لیٹی ہوئی تھیں۔ انھوں نے مجھے گلے لگایا اور کہا کہ میں نے سب کو ڈرا دیا تھا۔ پچھلے پانچ دِنوں سے مجھے تیز بخار تھا اورمیں مسلسل نیندمیں تھی۔ اچّن نے مجھے سوپ پلانے کی کوشش کی۔ شام کو ڈاکٹر پربھاکرن مجھے دیکھنے آئے۔ انھوں نے بھی بتایا کہ گھر میں سب لوگ کتنا گھبرا گئے تھے۔

اس رات بھی امّاں میرے ساتھ ہی سوئی۔ اچّن آئے اور ہمارے بستر پر بیٹھ گئے۔ اُن کے ہاتھ میں ایک پارسل تھا۔

''انجی مٹھائی...'' میں مسکرائی۔

اچّن کے چہرے پر بھی ایک مسکراہٹ آئی اور کہا، ''کتنے دنوں سے میں تمہارے لیے کچھ نہیں لایا تھا۔سوچاکچھ لے آؤں۔''

میں ایک ہی وقت میں تین 'انجی میٹھائی' کھا گئی۔ میں تو اس کا مزہ تک بھول گئی تھی۔ میٹھی،پھیکی، تیز... سب ساتھ ساتھ۔ کسی نے کچھ نہیں کہا اورمیں پھر دوبارہ سو گئی۔

اگلی صبح اٹھ کرمیں سیدھے باورچی خانے میں گئی۔ امّاں پہلے ہی جاگ گئی تھیں اور ناشتہ بنا رہی تھیں۔ کتنے عرصہ کے بعد میں نے انھیں اس طرح دیکھاتھا۔ وہ نہاچکی تھیں۔ان کے بال گیلے تھے اور' رادھا صابن' کی خوشبو سے مہک رہے تھے۔ بعد میں انھوں نے مجھے گرم پانی سے نہلایا اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں چھوٹی بچّی بن گئی ہوں۔

نہانے کے بعد میں باہر آئی،باغ خوبصورت لگ رہاتھا۔ سارے پودے تروتازہ نظر آ رہے تھے۔ میں آہستہ سے نیچے اتری اور پوسٹ آفس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ کوناخالی تھا۔ وہاں بوری والا نہیں تھا۔

تبھی امّاں پیچھے سے آئیں اور میرے کندھوں پر اپناہاتھ رکھا۔ ''اُس کاکیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔''وہ اسے 'کوڈیراوٹم' لے گئے تھے، پر...'' امّاں کچھ جھجکیں۔ ''رگھو نے بتایا کہ تیسرے دن وہ وہاں سے بھاگ گیا۔ وہ یہاں بھی نہیں آیا،کہیں دوسری جگہ چلا گیا ہوگا۔''

میری آنکھیں بھر آئیں۔ ''سب میری غلطی ہے،'' میں نے کہا۔ ''مجھے اُسے بتا دینا چاہیے تھا کہ یہ لوگ اُسے لے جانے کاپلان بنا رہے ہیں۔ اتنا پریشان کیے جانے سے پہلے ہی وہ بھاگ جاتا۔''

امّاں نے مجھے اپنی طرف گھما لیا اور میرے چہرے پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔ ”اِس میں تمہاری کوئی غلطی نہیں ہے،“ انھوں نے کہا۔ ”تم نہیں جانتی تھی کہ کیا کرنا ہے اور تمہارے ساتھ کوئی بھی نہیں تھا جو تمہیں سمجھاتا۔ تمہارے ساتھ میں بھی تو نہیں تھی۔“ انھوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور ہم واپس چل کر گھر کے برآمدے میں بیٹھ گئے۔

”کبھی کبھی ہم میں سے کسی کو نہیں معلوم ہوتا کہ کیا کرنا ٹھیک ہوگا۔“ وہ چُپ ہوگئی۔ میں نے ایک مینا کی آواز سنی اور سر اٹھاکر ڈھونڈنے لگی کہ وہ درخت پر کہاں بیٹھی ہے۔ ”وہ ٹھیک ہو جائے گا۔“ امّاں نے کہا۔ ”جب وہ لوٹ آئے تو تم اُسے کھانا دے سکتی ہو۔“ وہ کھڑی ہوگئی۔ ”آؤ میں تمہیں دودھ دیتی ہوں، پھر تھوڑی دیر کے لیے لیٹ جانا۔“

میں ان کی بات پر یقین کرنا چاہتی تھی پر مجھے معلوم تھا کہ وہ اَب کبھی نہیں آئے گا۔ وہ بہت ڈر گیا ہوگا۔ کسے معلوم، امّاں کی طرح ایک دن وہ بھی ٹھیک ہو جائے۔ میں نے تصوّر کیا کہ بوری والا ایک چھوٹے سے لڑکے کی اُنگلی پکڑے سڑک پر جا رہا ہے۔ پھر تصوّر کیا کہ وہ ایک کونے میں پیوند لگے کپڑے پہنے بیٹھا ہے۔ میں نے بستر پر بیٹھ کر اپنی کاپی کھولی۔ ان گرمیوں میں میری جادوئی لڑکی ڈیزی نے کچھ خاص کام نہیں کیا تھا۔ میں نے سوچا کہ اسے گھومنے بھیج دیتی ہوں جہاں وہ ایک داڑھی والے بھلے آدمی سے ملے گی اور دونوں مل کر کمال کے کارنامے انجام دیں گے۔

میں نے ابھی دو ہی صفحے لکھے تھے کہ رشیدہ کی آواز سنائی دی۔ وہ امّاں سے میری طبیعت کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ میں نے اپنی کاپی بند کی اور اُس سے ملنے کے لیے باہر آگئی۔

بوری والا BORIWALA

اصل کہانی (انگریزی): جیشری کلاتھل

آرٹ :راکھی پیشوانی

ترجمہ(انگریزی سے اُردو): ایم.اے.معید اور محمد مجیب الدین

ڈیزائن: کنک ششی

سیریز ایڈیٹر: دیپتا آچار

اُردو ایڈیٹرز: اسماء رشید اور ایم. اے.معید

ڈفرنٹ ٹیلز ٹیم: کے.للیتا، ڈی.وسنتہ، جیاشری کلاتل، اوما .بروگھوبنڈا، سُکنیہ کنارلی اور سُوزی تھارو۔

Anveshi ڈفرنٹ ٹیلز : پسماندہ ثقافتوں و علاقائی زبانوں کی کہانیاں انویشی ریسرچ سینٹر فار ومنزاسٹڈیز، حیدرآباد، کی ایک پہل۔

(c) انویشی: کہانی، آرٹ اور ڈیزائن

Developed with financial support from Parag Initiative of the Tata Trusts

پہلا ایڈیشن: 2025 ستمبر (کاپیاں1000)

کاغذ: 100 جی ایس ایم میٹ آرٹ اور 220 جی ایس ایم پیپر بورڈ(کور)

ISBN: 978-93-48176-61-5

قیمت: ₹ 150.00

ناشر: ایکلویا فاؤنڈیشن

جمنا لال بجاج پریسر

جنگھیڈی، بھوپال - 462026 (مدھیہ پردیش)

books@eklavya.in / www.eklavya.in

انویشی ریسرچ سینٹر فار ومنزاسٹڈیز

2-2-18/2/A

دُرگا بائی دیش مکھ کالونی، حیدرآباد - 500007 (تلنگانہ)

anveshirc@gmail.com ; www.anveshi.org.in

پرنٹر : آر.کے.سیکیوپرنٹ پرائیویٹ لمیٹڈ، بھوپال، فون نمبر: 2687589 755 91+

List of titles

Urdu

Chataai Aur Nani, Tum Roz Qat Likhna
School Ki Ankahi Kahaniyan
Tareeq Ke Saaye
Ghade Mein Chand
Tataki Phir Jeet Gayi Aur Shabaash Badeyya
Boriwala
Sire Paye Ka Saalan
Ek Ladka Do Naam Aur Shaija Ki Khalai Duniya
Maa

English

Head Curry
Moon in the Pot
Mother
The Sackclothman
Spirits from History
Tataki Wins Again & Braveheart Badeyya
Untold School Stories
The Two Named Boy & Other Stories
The Mat And Write Every Day, Ajji!

These books have also been published in Telugu, Malayalam, Hindi and Kannada.

بوری والا کون ہے؟ وہ کہاں سے آیا ہے؟ گاؤں کے ''پاگل'' کے بارے میں انّو کا تجسس ایک غیر متوقع دوستی کا باعث بنتا ہے اور خود اُس کی زندگی کے کچھ انہونے سوالات کے لئے ایک جواب بھی۔

چاہے وہ الفاظ میں ہو یا تصویروں میں، موجودہ بچّوں کا ادب متوسط طبقے کے بچّوں کی زندگی و دنیا کو نمایاں کرتا ہے۔ ''ڈفرنٹ ٹیلز'' کی کہانیاں بچّوں کے ادب کے اِس محدود دائرے سے نکل کر مختلف طبقات، ذات، مذہبی ثقافتوں اور جسمانی صلاحیتوں کے جانباز بچّوں سے ہماری ملاقات کرواتی ہیں۔ یہ کہانیاں نئے نظاروں، خوشبوؤں، آوازوں، خوشیوں اور غموں سے بھری ہیں اورایک مشترک و جامعہ ہندوستان کے لیے حقیقی دین ہیں۔

— سُوزی تھارو
اِسکالر، مصنفہ اور خواتین کی تحریک کی کارکن

DIFFERENT TALES

parag
AN INITIATIVE OF TATA TRUSTS

Anveshi eklavya

Price: ₹ 150.00

9 789348 176615

''ڈفرنٹ ٹیلز'' علاقائی زبانوں سے ایسی کہانیاں پیش کرتی ہیں جن کے بارے میں بچّوں کی کتابوں میں شاذ و نادر ہی پڑھا جاتاہے۔ ان میں سے بہت سی کہانیاں مصنف کے اپنے بچپن کی تصاویر ہیں جو اکثر مختلف ثقافتی دنیا میں پرورش پانے، ساتھیوں، والدین اور دیگر بالغوں کے ساتھ نئے تعلقات تلاش کرنے کے الگ الگ طریقوں کی عکاسی کرتی ہیں۔ یہ ہمیں لذیذ پکوانوں، منفرد کھیلوں، اسکول میں غیر متوقع اسباق، خلوص اور دوستی کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے دلکش سفر پر لے جاتی ہیں۔